رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۲۰

جلد ۶۰ عدد ۵ اگست ۱۹۶۳ء

ماہنامہ

# ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵-اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

# تربیت و اِصلاح کے لیے بے نظیر کُتب

## راہِ عمل

تالیف

مولانا جلیل احسن ندوی

- مُستند احادیثِ نبوی کا ایسا مختصر مجموعہ جو ایک عام مسلمان کو بہت سی بڑی بڑی کتابوں سے بے نیاز کر دے۔
- تعمیرِ سیرت کے لیے ایک بیش بہا خزینہ

صفحات: ۴۵۶ ہدیہ: ۶ روپے

## اذکارِ مسنُونہ

تالیف: علامہ حافظ ابنِ قیم

ترجمہ وحواشی: مولانا خلیل احمد حامدی

— اس کتاب میں آپ کو اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے سفر و حضر، مسجد و بازار، مسرت و غم، خلوت و جلوت تمام اوقات کے لیے مسنُون دعائیں ملیں گی۔

— بارگاہِ الٰہی میں مُستجاب جامع، پُراثر اور دلگداز دعاؤں کا مجموعہ۔ قیمت اعلیٰ ۰۰ر۴ روپے سستا ۵۰ر۲ روپے

قرآن کی

## چار بُنیادی اصطلاحیں

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

• اللہ • ربّ • عبادت • دین

- قرآن کی ان اصطلاحات کا صحیح مفہوم اور
- ان کا انقلابی پہلو۔
- قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے ایک ناگزیر کتاب

اعلیٰ ۲۵ر۳ روپے
سستا ۲۵ر۱ روپے

## مُسلمان کے شب و روز

از: اسعد گیلانی

— ایک مسلمان کی زندگی کے لیے مفصّل لائحہ عمل

پاکیزہ زندگی گزارنے کیلیے ایک بیش قیمت کتاب

صحابۂ کرام اور صلحائے امت کی پاکیزہ زندگیوں کا ایک عکس

— مسنون دعائیں اور عبادات۔ قیمت صرف ۲۵ر۳ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

# ترجمان القرآن لاہور

# فہرست مضامین

| جلد ۶۰ | اگست ۱۹۶۳ء | عدد ۵ |
|---|---|---|



ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن

اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

# اشارات

مرکزی مجلسِ شوریٰ جماعتِ اسلامی پاکستان کا جو خاص اجلاس لاہور میں آٹھ جولائی سے بارہ جولائی تک منعقد ہوا، اُس میں جماعت کے کام کا جائزہ لیا گیا اور مستقبل کے پروگرام کے متعلق بعض تجاویز پیش کی گئیں۔ یہ جائزہ اور تجاویز جماعت کے ہر بہی خواہ کی توجہ کی پوری طرح محتاج ہیں اس لیے آج ہم ان کے بارے میں چند معروضات پیش کریں گے۔

---

مجلس کے اس اجلاس میں جماعت کی رفتارِ ترقی کی جو مختلف رپورٹیں پیش کی گئیں اُن کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مارشل لا اٹھنے کے بعد ارکان اور متفقین کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے اور خاص طور پر مشرقی پاکستان میں جماعت کا اثر و نفوذ بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے چنانچہ اس وقت صورتِ حال یہ ہے:

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| ارکان کی تعداد | ۱۵۳۸ | مشرقی پاکستان | ۱۶۷ | مغربی پاکستان | ۱۳۷۱ |
| مقامی جماعتوں کی تعداد | ۲۰۹ | // | ۲۹ | // | ۱۸۰ |
| متفقین کی تعداد | ۴۲۲۷۴ | // | ۱۳۴۲۸ | // | ۲۸۸۴۶ |
| حلقہ ہائے متفقین کی تعداد | ۱۴۶۴ | // | ۵۳۳ | // | ۹۳۱ |
| دارالمطالعوں اور جماعتی لٹریچر کی لائبریریوں کی تعداد | ۵۵۵ | // | ۲۵۰ | // | ۳۰۵ |

مشرقی پاکستان کے طوفان زدگان کی امداد نقد: ۱۳۲۰۰۰-۰-۰ روپے

پارچات : ۷۳ گانٹھیں

نیا کپڑا : ۱۶۲۳ گز

ارکان کی تعداد گزشتہ ایک سال میں تین سو سے کچھ اوپر ہی بڑھی ہے اور اسی طرح متفقین کی تعداد میں بھی ہزاروں کا اضافہ ہوا ہے۔ جماعت کی یہ ترقی اس کے ارکان یا ہی خواہوں کی کاوشوں کی رہینِ منت نہیں بلکہ یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ اُس نے بالکل غیب سے اس کے بڑھنے کے سامان پیدا کر دیتے۔

رَبَّنَا اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ رَحۡمَةً وَّهَیِّئۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسۡأَلُكَ قُلُوۡبًا اَوَّاهَةً مُّخۡبِتَةً مُّنِیۡبَةً فِیۡ سَبِیۡلِكَ۔ اَللّٰهُمَّ لَكَ الۡحَمۡدُ كَالَّذِیۡ نَقُوۡلُ وَخَیۡرًا مِّمَّا نَقُوۡلُ۔

---

شوریٰ کی اس کارروائی میں چوہدری غلام محمد صاحب امیر جماعتِ اسلامی حلقہ کراچی کی وہ رپورٹ بھی سامنے آئی ہے جو انہوں نے افریقہ میں اسلام کی رفتارِ ترقی کے بارے میں اپنے ذاتی مشاہدات کی بنیاد پر پیش کی ہے۔ چوہدری صاحب حالات کا جائزہ لینے کے لیے خود افریقہ کے اہم مقامات پر تشریف لے گئے اور صورتِ حال کا اپنی آنکھوں سے مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ افریقہ میں اسلام کی ترقی کی رفتار اُس سے بہت مختلف ہے جو مغربی ممالک اور مصر کے اخبارات بیان کر رہے ہیں۔ "وہاں مسلمانوں کی طرف سے اب تک کوئی قابلِ ذکر منظم کام نہیں ہوا ہے اور نہ ہی ایسے ادارے ہی موجود ہیں جنہیں منظم کر کے اس کام میں لگایا جاسکے۔ البتہ فہمیدہ اور دُور اندیش مسلمانوں میں اس کی ضرورت کا احساس اُبھر رہا ہے۔"

اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لیے جماعت اسلامی کی مجلسِ شوریٰ نے اس امر کا فیصلہ کیا ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی دسمبر ۱۹۶۳ء میں بالکل اپنی ذاتی حیثیت میں مشرقی افریقہ کا دورہ کریں تاکہ کوئی جماعتی تعصبات تبلیغِ دین کی راہ میں حائل نہ ہونے پائیں۔

پھر اس دورہ کے اختتام پر وہیں اُن حضرات کی ایک کنونشن بلائی جائے جو سینوں میں اسلام کا درد رکھتے ہیں اور اس بات کے آرزومند ہیں کہ اللہ کا یہ دین دوسرے ادیان پر غالب ہو۔ انہی دردمند اصحاب کے اشتراک و تعاون سے وہاں ایک مضبوط تبلیغی ادارے کی بنا ڈالی جائے جو ایک نظم کے تحت اس کام کو آگے بڑھانے کی کوشش کرے۔

اس ادارے کو مضبوط بنانے اور اسے ہر قسم کی امداد بہم پہنچانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ دنیا کے سارے مسلمانوں کے ضمیر کو بیدار کیا جائے اور انہیں اس کام کی اہمیت کا اچھی طرح احساس دلایا جائے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے جماعت نے یہ طے کیا ہے کہ مولانا کی مراجعت پر پاکستان میں تمام دینی جماعتوں کے اشتراک سے ایک کانفرنس منعقد کی جائے اور اس میں ایک خالص دینی اور غیر جماعتی تبلیغی ادارے کی تشکیل کی جائے جو اس فرض کو ہر قسم کے تعصبات اور امتیازات سے بالاتر ہو کر بطریق احسن سرانجام دے۔

---

جماعت اسلامی تائید ایزدی سے اصلاحِ معاشرہ کے کام پر اپنے حالات اور وسائل کے مطابق شروع سے ہی اپنی توجہ صرف کر رہی ہے لیکن اس مرتبہ امیرِ محترم نے کام کا جو نیا نقشہ پیش فرمایا ہے وہ انشاء اللہ نتائج کے اعتبار سے زیادہ حوصلہ افزا ثابت ہوگا۔ مولانا کی تجویز یہ ہے کہ ملک کے اندر کچھ ایسے نمونے کے علاقے تیار کیے جائیں جو موجودہ حالات میں زیادہ سے زیادہ امکانی حد تک اسلامی معاشرے کے آئینہ دار ہوں تاکہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں کہ اسلامی معاشرے کی برکات کیا ہیں۔ اس غرض کے لیے پچیس پچیس، تیس تیس دیہات پر مشتمل کچھ ایسے علاقے منتخب کیے جائیں جہاں پہلے ہی جماعت کے اثرات کافی پھیل چکے ہیں ان میں سے ہر ہر گاؤں میں مضبوط حلقہ ہائے متفقین منظم کیے جائیں اور ان حلقوں میں باہمی ربط پیدا کر کے ایک ٹھوس بلاک بنا دیا جائے۔ پھر اس بلاک کے اندر منظم طریقہ سے بتدریج مساجد کی اصلاحِ حال، جرائم اور فواحش کے انسداد، دارالمطالعوں، سکولوں اور دینی تعلیم کے

مدرسوں کے قیام، راستوں کی درستی، صحت و صفائی اور طبی امداد کے انتظام، بستی کے یتیموں بیواؤں معذوروں اور غریب طالب علموں کی امداد، زکوٰۃ اور عشر کی تنظیم، باہمی تنازعات کے بستی میں ہی فیصلے اور امداد باہمی کے اداروں کے قیام کا انتظام کیا جاتے "۔

---

اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے ہوئے کس قسم کی مشکلات راستے میں حائل ہونگی، ان کے بارے میں کوئی چیز بھی یقین اور وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ یہ بڑی ہی کٹھن اور مشکل منزل ہے برسوں کے بگڑے ہوتے معاشرے کے اندر نیکی اور بھلائی کی بالا دستی کو بالفعل قائم کرنا جوتے شیر لانے سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ اس راہ میں قدم قدم پر مزاحمتیں ہونگی۔ شریر لوگ باہم منظم ہو کر اس کی راہ روکنے کی پوری کوشش کریں گے۔ مفادات کے پرستار اپنے مفادات کو خطرات میں پڑتے ہوتے دیکھ کر اس کے خلاف ہر قسم کی غلط فہمیاں پھیلائیں گے۔ جن لوگوں کی برسہا برس سے چودھراہٹیں قائم ہیں، انہیں اس سے سخت کرب و اضطراب محسوس ہوگا اور وہ اس بات کے لیے پوری قوت کے ساتھ جدوجہد کریں گے کہ کسی طرح یہ تحریک کامیاب نہ ہونے پاتے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر اللہ نے کرم فرمایا اور اس کام کے لیے کچھ مخلص، درد مند اصحاب بصیرت آگے بڑھے اور انہوں نے دلسوزی و یکسوئی اور فہم و تدبر کے ساتھ اس کام کو آگے بڑھایا تو یہ تجربہ کامیاب ثابت ہوگا۔

---

برائی اگر منظم ہو کر معاشرے کے رگ و پے میں سرایت کر کے اس کے سارے جسم کو زہر آلود کر سکتی ہے تو آخر نیکی اس کے اندر نفوذ کر کے اُسے صحت و توانائی کیوں نہیں بخش سکتی؟ بُرائی اگر جسم و جان کا سب سے خطرناک روگ ہے، تو نیکی اس کے مقابلے میں سراپا شفا ہے سر تا پا رحمت ہے، سکونِ قلب کے حصول کا واحد سرچشمہ ہے، اس کے ذریعہ باہمی رقابتیں ختم ہوتی ہیں۔ لوگوں کے درمیان محبت اور مودّت کے رشتے مضبوط ہوتے ہیں، اور ان کے اندر ایثار، ہمدردی، جرأت اور عزتِ نفس جیسی بلند صفات پرورش پاتی ہیں۔

آپ اگر خیر و شر کی باہمی آویزش کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا کے ہر معاشرے میں خدا خوفی، پرہیزگاری، تقویٰ اور پاکبازی کو ہمیشہ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ جو لوگ انفرادی طور پر ان صفات کے حامل ہوتے ہیں، اُن کی سوسائٹی کے ہر طبقے میں بڑی آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ لیکن انسانوں کا یہی مقدس گروہ جب نیکی، شرافت اور خدا ترسی کو کسی معاشرے کے اندر عملاً قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے تو پھر دنیا میں اس سے زیادہ مغضوب اور قابلِ نفرت طبقہ اور کوئی نہیں ہوتا۔ اس باطل فلسفہ کے مطابق نیکی اُسی وقت تک قابلِ قدر ہے جب تک یہ انفرادیت کے دائرہ سے باہر قدم رکھنے کی جسارت نہیں کرتی، یہ یقیناً ایک سعادت اور برکت ہے لیکن اسی حد تک جہاں تک یہ دل کی گہرائیوں کو منور کرتی رہے۔ لیکن جونہی اس کے اندر باطل کی تاریکیوں کے خلاف صف آرا ہونے کا جذبہ اور ولولہ پیدا ہو تو پھر یہ ہوسناکی بن جاتی ہے اور اس وجہ سے اس کے راستے میں مزاحم ہونا ضروری ہے۔ اس غلط نظریہ کے حامین شاید نیکی کو صرف ایک ایسی لطیف قلبی کیفیت خیال کرتے ہیں جو آب و گل کی دنیا میں منتقل ہونے کی اول تو سرے سے صلاحیت ہی نہیں رکھتی یا اگر کسی طرح کوشش کر کے اُس میں یہ صلاحیت پیدا کی جائے تو وہ اپنی لطافت کھو بیٹھتی ہے۔ ان کی نظر میں نیکی ایک ناقابلِ اظہار وجدانی کیفیت ہے جس کا تمام تر تعلق داخلی زندگی سے ہے اور اس بنا پر خارجی زندگی میں اس سے کوئی فائدہ اٹھانا ممکن نہیں بلکہ وہ "دل من داند و من دانم و داند دل من" کی مصداق ہے۔

---

نیکی کا یہ غلط تصور کسی ایک مقام یا عہد کے ساتھ وابستہ نہیں بلکہ مفاد پرست طبقوں نے اس باطل خیال کو ہر دور اور ہر معاشرے میں بڑی تدبیر اور طاقت کے ساتھ پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اس زہر کے اثرات ہم پورے معاشرے میں بڑی شدّت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں نیکی اور پارسائی کا نقشہ کچھ اس طرح اُبھر کر سامنے آتا ہے کہ کوئی شخص کارجہاں سے بالکل الگ تھلگ گیان دھیان میں مصروف رہے۔ اُسے دنیا اور اس کے دھندوں سے کوئی

سروکار نہ ہو۔ وہ اگرچہ بھلائی کا علمبردار ہونے کا دعویٰ کرتا رہے۔ اور بوقتِ ضرورت خیر کے کلمات بھی اس کی زبان فیض ترجمان سے نکلتے رہیں لیکن وہ بُرائی کے خلاف نبرد آزما ہونے سے ہمیشہ پرہیز کرے کیونکہ خیر و شر کی کشمکش میں اگر وہ براہ راست شریک ہو جاتے تو اس کے دامنِ تقدس پر دنیاداری کے کچھ چھینٹے پڑنے کا پورا پورا احتمال ہے۔

پاکبازی کا یہ غلط نقشہ ہمارے ذہنوں میں اس قدر پختگی کے ساتھ بیٹھ گیا ہے کہ ہم جب بھی کسی نیک اور خداترس انسان کو برائی کے خلاف عملاً جدوجہد کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہمارے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے اونچے اور خداوند تعالیٰ جیسی بلند و بالا ذات سے لگاؤ اور محبت کرنے والے شخص کو امورِ دنیا میں دخیل ہونا زیب نہیں دیتا۔

---

مجھے بارہا کئی ایسے نیک نفس انسانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جن کی خدا خوفی، پرہیزگاری، تقویٰ اور للّٰہیت کی کبھی سوسائٹی میں بڑی دھوم تھی لیکن جب انہوں نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی اور اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی تو پھر لوگوں نے ان پر بلا تکلف دنیا پرستی اور مفاد پرستی کے الزامات عائد کیے حالانکہ ان کی زندگی کا کوئی فعل اُن کے ان بے بنیاد الزامات کی تصدیق نہیں کرتا۔ میں اُن کی شریفانہ زندگیوں پر جب کبھی غور کرتا ہوں تو انہیں پہلے کے مقابلے میں زیادہ خداترس، نبی آخرالزماں کا زیادہ فدائی اور متبع، حلال و حرام کے معاملے میں زیادہ محتاط اور ایثار اور قربانی میں زیادہ پُرجوش پاتا ہوں لیکن ایک طبقہ ہے کہ انہیں دنیا پرستی کے طعنے دیے جاتا ہے۔ ان طعنہ دینے والوں سے کئی مرتبہ تبادلۂ خیالات بھی ہوا اور میں نے ان سے دنیا پرستی کے الزام کی حقیقت بھی معلوم کرنا چاہی لیکن اس معاملے میں انہیں جتنا زیادہ ٹٹولا یہی تلخ حقیقت اُبھر کر سامنے آئی کہ ان کے ذہن یہ باور ہی نہیں کر سکتے کہ کوئی خداپرست امورِ دنیا میں براہِ راست دخیل ہو کر اُن کی اصلاح کی کوشش کرے۔ انہوں نے اپنے احساسات کا اظہار کرتے ہوئے جو فقرات اپنی زبان سے بالکل غیر شعوری طور پر ادا کیے وہ ان کے

اس غلط نقطۂ نظر کی پوری طرح ترجمانی کرتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب نے فرمایا: "کسی اللہ والے کو انتخابات کے جھگڑوں سے کیا کام، یہ تو ہڈی ہے جس کی طرف سگِ دنیا ہی لپکتا ہے"۔ دوسرا شخص جس نے عدالت میں ایک صاحبِ اقتدار ظالم کے خلاف ڈٹ کر شہادت دی تھی، اُس کے بارے میں یہ کہا جانے لگا کہ عدالتوں کے چکر کاٹ کاٹ کر اُس کی روحانیت مُردہ ہو جائے گی۔ تیسرا شخص جس کی طرف ہمارے گاؤں کا ہر غریب اور مظلوم دادرسی کے لیے رجوع کرتا تھا، اُس کے متعلق یہ غلط فہمی پھیلائی جانے لگی کہ یہ شخص اپنی چودھراہٹ قائم کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے۔ ایک چوتھا شخص جس نے بنیادی جمہوریتوں کے صدر کی حیثیت سے نہایت ہی قابلِ ستائش خدمات سرانجام دی ہیں اور کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر ہر جھگڑے کا فیصلہ عدل و انصاف کی معتدل میزان پر تول کر کیا ہے، اُس کے متعلق یہ الفاظ سننے میں آتے ہیں: "یہ اچھے بھلے اللہ اللہ کر رہے تھے اب انہیں بھی حکومت کی چاٹ لگ گئی ہے۔ ان کا سارا وقت جھگڑے چکانے میں ضائع ہو رہا ہے"۔ خدا کے ان نیک بندوں پر اگرچہ الزامات کی نوعیتیں مختلف ہیں لیکن ان کے بارے میں فیصلہ ایک ہی ہے کہ اس "دنیا کے کاموں" میں الجھ جانے کی وجہ سے ان کا خدا سے تعلق کم ہو گیا ہے اور وہ روحانیت کے بلند مقام سے نیچے اُتر کر دنیاداروں کی پست سطح پر آ گئے ہیں۔ اس رائے کا اظہار اس کثرت سے کیا جاتا ہے کہ یہ حضرات اس سے خود بھی کبھی کبھی متاثر ہو کر یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ "آخر یہ دنیا کے مصائب ہی ہیں جن میں ہم بلاوجہ اپنی قوتیں اور صلاحیتیں کھپا رہے ہیں"۔

---

امورِ دنیا اور امورِ دین کی اس تفریق کی جڑیں بڑی گہری ہیں اور انہیں دنیا پرستوں کی چالاکی اور عیاری نے بڑی حکمت اور دانائی کے ساتھ لوگوں کے قلب و دماغ میں اچھی طرح پیوست کیا ہے۔ شیطان اور اُس کے گماشتے اپنے کاروبار کو کبھی بھی چمکا نہیں سکتے جب تک انہیں اس امر کا پوری طرح یقین نہ ہو جائے کہ نیکی اور بھلائی کے علمبردار اُن کے راستے میں

(باقی صفحہ ۵ پر)

# تفہیم القرآن

## الصافات

(۴)

انہوں نے اللہ اور ملائکہ[۸۹] کے درمیان نسب کا رشتہ بنا رکھا ہے، حالانکہ ملائکہ خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ مجرم کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں (اور وہ کہتے ہیں کہ) "اللہ اُن صفات سے پاک ہے جو اُس کے خالص بندوں کے سوا دوسرے لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں پس تم اور تمہارے یہ معبود اللہ سے کسی کو پھیر نہیں سکتے مگر صرف اُس کو جو دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھلسنے والا ہو[۹۰]۔ اور ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کا ایک مقام مقرر ہے[۹۱]۔ اور ہم صف بستہ خدمت گار ہیں اور تسبیح کرنے والے ہیں"۔

یہ لوگ پہلے تو کہا کرتے تھے کہ کاش ہمارے پاس وہ "ذکر" ہوتا جو پچھلی قوموں کو ملا تھا تو ہم اللہ

---

۸۹ اصل میں ملائکہ کے بجائے الجنّۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ لیکن بعض اکابر مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں جِن کا لفظ اپنے لغوی مفہوم (پوشیدہ مخلوق) کے لحاظ سے ملائکہ کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ ملائکہ بھی اصلاً ایک پوشیدہ مخلوق ہی ہیں۔ اور بعد کا مضمون اسی بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہاں الجنّۃ کے لفظ کو ملائکہ کے معنی میں لیا جائے۔

۹۰ اس آیت کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے: "پس تم اور تمہاری یہ عبادت، اِس پر تم کسی کو فتنے میں نہیں ڈال سکتے مگر صرف اُس کو جو . . . " اِس دوسرے ترجمے کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اے گمراہو، یہ جو تم ہماری پرستش کر رہے ہو اور ہمیں اللہ رب العالمین کی اولاد قرار دے رہے ہو، اس سے تم ہم کو فتنے میں نہیں ڈال سکتے۔ اِس سے تو کوئی ایسا احمق ہی فتنے میں پڑ سکتا ہے جس کی شامت سر پہ سوار ہو

کے چیدہ بندے ہوتے[92] مگر (جب وہ آگیا) تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ اب عنقریب انہیں (اس روش کا نتیجہ) معلوم ہو جائے گا۔ اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا[93]۔ پس (اے نبی) ذرا کچھ مدت تک انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور دیکھتے رہو، عنقریب یہ خود بھی دیکھ لیں گے[94]۔ کیا یہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں؟ جب وہ ان کے صحن میں آ اترے گا تو وہ دن اُن لوگوں کے لیے بہت بُرا ہوگا جنہیں متنبہ کیا جا چکا ہے۔ بس ذرا انہیں کچھ مدت کے لیے

---

دوسرے الفاظ میں گویا فرشتے اپنے ان پرستاروں سے کہہ رہے ہیں کہ "برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ"۔

[91] یعنی اللہ کی اولاد ہونا تو درکنار، ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم میں سے جس کا جو درجہ اور مرتبہ مقرر ہے اس سے ذرہ برابر تجاوز کرنے تک کی مجال ہم نہیں رکھتے۔

[92] یہی مضمون سورۂ فاطر، آیت ۴۲ میں گزر چکا ہے۔

[93] اللہ کے لشکر سے مراد وہ اہلِ ایمان ہیں جو اللہ کے رسول کی پیروی کریں اور اس کا ساتھ دیں نیز وہ غیبی طاقتیں بھی اس میں شامل ہیں جن کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اہلِ حق کی مدد فرماتا ہے۔

اس امداد اور غلبہ کے معنی لازماً یہی نہیں ہیں کہ ہر زمانہ میں اللہ کے ہر نبی اور اس کے پیروؤں کو سیاسی غلبہ ہی حاصل ہو۔ بلکہ اس غلبے کی بہت سی صورتیں ہیں جن میں سے ایک سیاسی غلبہ بھی ہے۔ جہاں اس نوعیت کا استیلاء اللہ کے نبیوں کو حاصل نہیں ہوا ہے، وہاں بھی ان کا اخلاقی تفوّق ثابت ہو کر رہا ہے۔ جن قوموں نے ان کی بات نہیں مانی ہے اور ان کی دی ہوئی ہدایات کے خلاف راستہ اختیار کیا ہے وہ آخر کار برباد ہو کر رہی ہیں۔ جہالت و ضلالت کے جو فلسفے بھی لوگوں نے گھڑے اور زندگی کے جو بگڑے ہوئے اطوار بھی زبردستی رائج کیے گئے وہ سب کچھ مدت تک زور دکھانے کے بعد آخر کار اپنی موت آپ مر گئے مگر جن حقیقتوں کو ہزارہا برس سے اللہ کے نبی حقیقت و صداقت کی حیثیت سے پیش کرتے رہے ہیں وہ پہلے بھی اٹل تھیں اور آج بھی اٹل ہیں۔ انہیں اپنی جگہ سے کوئی ہلا نہیں سکا ہے۔

[94] یعنی کچھ زیادہ مدت نہ گزرے گی کہ اپنی شکست اور تمہاری فتح کو یہ لوگ خود اپنی آنکھوں

چھوڑ دو اور دیکھتے رہو، عنقریب یہ خود دیکھ لیں گے۔

پاک ہے تیرا رب، عزت کا مالک، اُن تمام باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں، اور سلام ہے مُرسَلین پر، اور ساری تعریف اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ ع۵

سے دیکھ لیں گے۔ یہ بات جس طرح فرمائی گئی تھی اسی طرح پوری ہوئی۔ ان آیات کے نزول پر بمشکل ۱۴-۱۵ سال گزرے تھے کہ کفارِ مکہ نے اپنی آنکھوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فاتحانہ داخلہ دیکھ لیا، اور پھر اس کے چند سال بعد انہی لوگوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اسلام نہ صرف عرب پر بلکہ روم و ایران کی عظیم الشان سلطنتوں پر بھی غالب آگیا۔

---

# تفہیم القرآن

## سورۃ ص

نام | آغاز ہی کے حرف ص کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول | جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا، بعض روایات کی رو سے یہ سورۃ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں علانیہ دعوت کا آغاز کیا تھا اور قریش کے سرداروں میں اس پر کھلبلی مچ گئی تھی۔ اس لحاظ سے اس کا زمانۂ نزول تقریباً نبوت کا چوتھا سال قرار پاتا ہے۔ بعض دوسری روایات اسے حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کے بعد کا واقعہ بتاتی ہیں، اور معلوم ہے کہ وہ ہجرتِ حبشہ کے بعد ایمان لائے تھے۔ ایک اور سلسلۂ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوطالب کے آخری مرض کے زمانہ میں وہ معاملہ پیش آیا تھا جس پر یہ سورۃ نازل ہوئی۔ اسے اگر صحیح مانا جائے تو اس کا زمانۂ نزول نبوت کا دسواں یا گیارہواں سال ہے۔

تاریخی پس منظر | امام احمد، نسائی، ترمذی، ابن جریر، ابن ابی شیبہ، ابن ابی حاتم اور

محمد بن اسحاق وغیرہ نے جو روایات نقل کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ابوطالب بیمار ہو گئے اور قریش کے سرداروں نے محسوس کیا کہ اب یہ ان کا آخری وقت ہے تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ چل کر شیخ سے بات کرنی چاہیے۔ وہ ہمارا اور اپنے بھتیجے کا جھگڑا چکا جائیں تو اچھا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا انتقال ہو جائے اور ان کے بعد ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کوئی سخت معاملہ کریں اور عرب کے لوگ ہمیں طعنہ دیں کہ جب تک شیخ زندہ تھا، یہ لوگ اس کا لحاظ کرتے رہے، اب اس کے مرنے کے بعد ان لوگوں نے اس کے بھتیجے پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اس رائے پر سب کا اتفاق ہو گیا اور تقریباً ۲۵ سرداران قریش، جن میں ابوجہل، ابوسفیان، اُمیّہ بن خلف، عاص بن وائل، اسود بن المطلب، عقبہ بن ابی مُعیط، عُتبہ اور شیبہ شامل تھے، ابوطالب کے پاس پہنچے۔ ان لوگوں نے پہلے تو حسب معمول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنی شکایات بیان کیں، پھر کہا ہم آپ کے سامنے ایک انصاف کی بات پیش کرنے آئے ہیں۔ آپ کا بھتیجا ہمیں ہمارے دین پر چھوڑ دے اور ہم اسے اس کے دین پر چھوڑے دیتے ہیں۔ وہ جس معبود کی عبادت کرنا چاہے کرے ہمیں اس سے کوئی تعرض نہیں۔ مگر وہ ہمارے معبودوں کی مذمت نہ کرے اور یہ کوشش نہ کرتا پھرے کہ ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ اس شرط پر آپ ہم سے اس کی صلح کرا دیں۔ ابوطالب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور آپ سے کہا کہ بھتیجے، یہ تمہاری قوم کے لوگ میرے پاس آئے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ تم ایک منصفانہ بات پر ان سے اتفاق کر لو تاکہ تمہارا اور ان کا جھگڑا ختم ہو جائے۔ پھر انہوں نے وہ بات حضورؐ کو بتائی جو سرداران قریش نے ان سے کہی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا، چچا جان، میں تو ان کے سامنے ایک ایسا کلمہ پیش کرتا ہوں جسے اگر یہ مان لیں تو عرب ان کا تابع فرمان اور عجم ان کا باج گزار ہو جائے۔[1] یہ سن کر پہلے تو وہ لوگ سٹ پٹا گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا

[1] حضورؐ کے اس ارشاد کو مختلف راویوں نے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ آپ نے

تھا کہ آخر آپ کہہ کر ایسے ایک مفید کلمے کو رد کر دیں۔ پھر کچھ سنبھل کر بولے، تم ایک کلمہ کہتے ہو، ہم ایسے دس کلمے کہنے کو تیار ہیں، مگر یہ تو بتاؤ کہ وہ کلمہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا لا الٰہ الا اللہ۔ اس پر وہ سب یک بارگی اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ باتیں کہتے ہوئے نکل گئے جو اس سورۃ کے ابتدائی حصے میں اللہ تعالیٰ نے نقل کی ہیں۔

ابن سعد نے طبقات میں یہ سارا قصہ اُسی طرح بیان کیا ہے جس طرح اوپر مذکور ہوا، مگر اُن کی روایت کے مطابق یہ ابوطالب کے مرضِ وفات کا نہیں بلکہ اس وقت کا واقعہ ہے جب حضورؐ نے دعوتِ عام کی ابتدا کی تھی اور مکہ میں پے در پے یہ خبریں پھیلنی شروع ہو گئی تھیں کہ آج فلاں آدمی مسلمان ہوا اور کل فلاں۔ اُس وقت سردارانِ قریش یکے بعد دیگرے کئی وفد ابوطالب کے پاس لے کر پہنچے تھے تاکہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تبلیغ سے روک دیں اور انہی وفود میں سے ایک وفد کے ساتھ یہ گفتگو ہوئی تھی۔

---

اریدهم علی کلمة واحدة یقولونها تدین لهم بها العرب وتؤدی الیهم بها العرب الجزیة۔ دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں: ادعوهم الی ان یتکلموا بکلمة تدین لهم بها العرب ویملکون بها العجم۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے ابوطالب کے بجائے قریش کے لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا کلمة واحدة تعطونیها تملکون بها العرب وتدین لکم بها العجم۔ اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: ارأیتم ان اعطیتکم کلمة تکلمتم بها ملکتم بها العرب ودانت لکم بها العجم۔ ان لفظی اختلافات کے باوجود مدعا سب کا یکساں ہے، یعنی حضورؐ نے ان سے کہا کہ اگر میں ایک ایسا کلمہ تمہارے سامنے پیش کروں جسے قبول کر کے تم عرب و عجم کے مالک ہو جاؤ گے تو بتاؤ کہ یہ زیادہ بہتر ہے یا وہ جسے تم انصاف کی بات کہہ کر میرے سامنے پیش کر رہے ہو؟ تمہاری بھلائی اس کلمے کو مان لینے میں ہے یا اس میں کہ جس حالت میں تم پڑے ہو اُس میں تم کو پڑا رہنے دوں اور میں اپنی جگہ اپنے خدا کی عبادت کرتا رہوں؟

زمخشری، رازی، نیشاپوری اور بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ یہ وفد ابو طالب کے
پاس اس وقت گیا تھا جب حضرت عمرؓ کے ایمان لانے پر سردارانِ قریش بوکھلا گئے تھے لیکن
کتبِ روایت میں سے کسی میں اس کا حوالہ ہمیں نہیں مل سکا ہے اور نہ ان مفسرین نے اپنے
ماخذ کا حوالہ دیا ہے۔ تاہم اگر یہ صحیح ہو تو یہ ہے سمجھ میں آنے والی بات۔ اس لیے کہ کفارِ
قریش پہلے ہی یہ دیکھ کر گھبرائے ہوئے تھے کہ اسلام کی دعوت سے کہ ان کے درمیان ایک
ایسا شخص اٹھا ہے جو اپنی شرافت، بے داغ سیرت اور دانائی و سنجیدگی کے اعتبار سے
ساری قوم میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اور پھر اس کا دستِ راست ابو بکر جیسا آدمی ہے
جسے مکے اور اس کے اطراف کا بچہ بچہ ایک نہایت شریف، راستباز اور ذکی انسان
کی حیثیت سے جانتا ہے۔ اب جو انہوں نے دیکھا ہوگا کہ عمر بن خطاب جیسا جری اور
صاحبِ عزم آدمی بھی ان دونوں سے جا ملا ہے تو یقیناً انہیں محسوس ہوا ہوگا کہ خطرہ حدِ
برداشت سے گزرتا جا رہا ہے۔

**موضوع اور مباحث** اوپر جس مجلس کا ذکر کیا گیا ہے اُسی پر تبصرے سے اس سورۃ کا آغاز
ہوا ہے۔ کفار اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کو بنیاد بنا کر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ان لوگوں
کے انکار کی اصل وجہ دعوتِ اسلامی کا کوئی نقص نہیں ہے بلکہ ان کا اپنا تکبر اور حسد اور تقلیدِ
اعمیٰ پر اصرار ہے۔ یہ اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اپنی ہی برادری کے ایک آدمی کو خدا کا نبی
مان کر اُس کی پیروی قبول کریں۔ یہ اُنہی جاہلانہ تخیلات پر جمے رہنا چاہتے ہیں جن پر انہوں نے
اپنے قریبی زمانے کے لوگوں کو پایا ہے، اور جب اس جہالت کے پردے کو چاک کر کے
ایک شخص ان کے سامنے اصل حقیقت کو پیش کرتا ہے تو یہ اس پر کان کھڑے کرتے ہیں
اور اسے عجیب بات بلکہ نرالی اور انہونی بات قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک توحید اور
آخرت کا تخیل محض ناقابل قبول ہی نہیں ہے بلکہ ایک ایسا تخیل ہے جس کا بس مذاق ہی
اڑایا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے سورہ کے ابتدائی حصے میں بھی اور آخری فقروں میں بھی کفار کو صاف صاف متنبہ کیا ہے کہ جس شخص کا تم آج مذاق اڑا رہے ہو اور جس کی رہنمائی قبول کرنے سے تم کو آج سخت انکار ہے، عنقریب وہی غالب آکر رہے گا اور وہ وقت دُور نہیں ہے جب اسی شہر مکہ میں، جہاں تم اس کو نیچا دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہو، اس کے آگے تم سب سرنگوں نظر آؤ گے۔

پھر پے در پے ۹ پیغمبروں کا ذکر کر کے، جن میں حضرت داؤد و سلیمان کا قصہ زیادہ مفصل ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ بات سامعین کے ذہن نشین کرائی ہے کہ اُس کا قانونِ عدل بالکل بے لاگ ہے، اس کے ہاں انسان کا صحیح رویہ ہی مقبول ہے، بے جا بات خواہ کوئی بھی کرے وہ اس پر گرفت کرتا ہے، اور اس کے ہاں وہی لوگ پسند کیے جاتے ہیں جو لغزش پر اصرار نہ کریں بلکہ اُس پر متنبہ ہوتے ہی تائب ہو جائیں اور دنیا میں آخرت کی جواب دہی کو یاد رکھتے ہوئے زندگی بسر کریں۔

اس کے بعد فرماں برداروں اور سرکش بندوں کے اُس انجام کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو وہ عالمِ آخرت میں دیکھنے والے ہیں اور اس سلسلے میں کفار کو دو باتیں خاص طور پر بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ آج جن سرداروں اور پیشواؤں کے پیچھے جاہل لوگ اندھے بن کر ضلالت کی راہ پر چلے جا رہے ہیں، کل وہی جہنم میں اپنے پیروؤں سے پہلے پہنچے ہوئے ہوں گے اور دونوں ایک دوسرے کو کوس رہے ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ آج جن اہل ایمان کو یہ لوگ ذلیل و خوار سمجھ رہے ہیں، کل یہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حیرت کے ساتھ دیکھیں گے کہ اُن کا جہنم میں کہیں نام و نشان تک نہیں ہے اور یہ خود اُس کے عذاب میں گرفتار ہیں۔

آخر میں قصّۂ آدم و ابلیس کا ذکر فرمایا گیا ہے اور اس سے مقصود کفارِ قریش کو یہ بتانا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے جھکنے سے جو تکبر تمہیں مانع ہو رہا ہے وہی تکبر آدم کے آگے جھکنے سے ابلیس کو بھی مانع ہوا تھا۔ خدا نے جو مرتبہ آدم کو دیا تھا اُس پر

ابلیس نے حسد کیا اور حکمِ خدا کے مقابلے میں سرکشی اختیار کر کے لعنت کا مستحق ہوا۔ اسی طرح جو مرتبہ خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا ہے اُس پر تم حسد کر رہے ہو اور اس بات کے لیے تیار نہیں ہو کہ جسے خدا نے رسول مقرر کیا ہے اس کی اطاعت کرو۔ اس لیے جو انجام ابلیس کا ہونا ہے وہی آخر کار تمہارا بھی ہونا ہے۔

---

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

ص[1]، قسم ہے نصیحت بھرے[2] قرآن کی، بلکہ یہی لوگ جنہوں نے ماننے سے انکار کیا ہے، سخت تکبر اور ضد میں مبتلا ہیں[3]۔ اِن سے پہلے ہم کتنی ہی ایسی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں اور

---

[1] اگرچہ تمام حروفِ مقطعات کی طرح ص کا مفہوم متعین کرنا بھی مشکل ہے، لیکن ابن عباس اور ضحاک کا یہ قول بھی کچھ دل کو لگتا ہے کہ اس سے مراد ہے صادقٌ فی قولہٖ، یا صَدَقَ محمدٌ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم صادق ہیں، جو کچھ کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں۔ صاد کے حرف کو ہم اردو میں بھی اسی سے ملتے جلتے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں میں اس پر صاد کرتا ہوں، یعنی اس کی تصدیق کرتا ہوں، یا اسے صحیح قرار دیتا ہوں۔

[2] اصل الفاظ ہیں ذی الذکر۔ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک ذی شرف یعنی قرآن بزرگ۔ دوسرے ذی التذکیر یعنی نصیحت سے لبریز قرآن، یا بھولا ہوا سبق یاد دلانے والا اور غفلت سے چونکانے والا قرآن۔

[3] اگر ص کی وہ تاویل قبول کی جائے جو ابن عباس اور ضحاک نے بیان کی ہے تو اس جملے کا مطلب یہ ہوگا کہ قسم ہے اس قرآنِ بزرگ، یا اس نصیحت سے لبریز قرآن کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچی بات پیش کر رہے ہیں، مگر جو لوگ انکار پر تلے ہوئے ہیں وہ دراصل ضد اور تکبر میں مبتلا ہیں۔ اور اگر ص کو اُن حروفِ مقطعات میں سے سمجھا جائے جن کا مفہوم متعین نہیں کیا جا سکتا، تو پھر قسم کا جواب محذوف ہے جس پر "بلکہ" اور اس کے بعد کا فقرہ خود روشنی ڈالتا ہے۔ یعنی پوری عبارت پھر یوں ہو گی کہ "اِن منکرین کے انکار کی وجہ نہیں یہ

جب اُن کی شامت آئی ہے، تو وہ چیخ اٹھے ہیں، مگر وہ وقت بچنے کا نہیں ہوتا۔

اِن لوگوں کو اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ ایک ڈرانے والا خود اِنہی میں سے آگیا۔[۵] منکرین کہنے لگے کہ "یہ ساحر[۶] ہے، سخت جھوٹا ہے، کیا اِس نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے"۔ اور سردارانِ قوم یہ کہتے ہوئے نکل گئے[۷] کہ "چلو اور ڈٹے رہو اپنے معبودوں کی عبادت پر۔ یہ بات تو کسی اور ہی غرض سے کی جا رہی ہے[۸]۔ یہ بات

---

کہ جو دین اِن کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اُس میں کوئی خلل ہے، یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے اظہارِ حق میں کوئی کوتاہی کی ہے، بلکہ اس کی وجہ صرف ان کی جھوٹی شیخی، ان کی جاہلانہ نخوت اور ان کی ہٹ دھرمی ہے، اور اس پر یہ نصیحت بھرا قرآن شاہد ہے جسے دیکھ کر ہر غیر متعصب آدمی تسلیم کرے گا کہ اس میں فہمائش کا حق پوری طرح ادا کر دیا گیا ہے۔"

۵ یعنی یہ ایسے احمق لوگ ہیں کہ جب ایک دیکھا بھالا آدمی خود اِن کی اپنی جنس، اپنی قوم اور اپنی ہی برادری میں سے ان کو خبردار کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تو ان کو یہ عجیب بات معلوم ہوتی۔ حالانکہ عجیب بات اگر ہوتی تو یہ ہوتی کہ انسانوں کو خبردار کرنے کے لیے آسمان سے کوئی اور مخلوق بھیج دی جاتی، یا ان کے درمیان یکایک ایک اجنبی آدمی کہیں باہر سے آکھڑا ہوتا اور نبوت کرنی شروع کر دیتا۔ اُس صورت میں تو بلا شبہ یہ لوگ بجا طور پر کہہ سکتے تھے کہ یہ عجیب حرکت ہمارے ساتھ کی گئی ہے، بھلا جو انسان ہی نہیں ہے وہ ہمارے حالات اور جذبات اور ضروریات کو کیا جانے گا کہ ہماری رہنمائی کر سکے، یا جو اجنبی آدمی اچانک ہمارے درمیان آگیا ہے اس کی صداقت کو آخر ہم کیسے جانچیں اور کیسے معلوم کریں کہ یہ بھروسے کے قابل آدمی ہے یا نہیں۔ اس کی سیرت و کردار کو ہم نے کب دیکھا ہے کہ اس کی بات کا اعتبار کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر سکیں۔

۶ حضورؐ کے لیے ساحر کا لفظ وہ لوگ اس معنی میں بولتے تھے کہ یہ شخص کچھ ایسا جادو کرتا ہے جس سے آدمی دیوانہ ہو کر اس کے پیچھے لگ جاتا ہے، کسی تعلق کے کٹ جانے اور کوئی نقصان پہنچ جانے کی پروا نہیں کرتا، باپ کو بیٹا اور بیٹے کو باپ چھوڑ بیٹھتا ہے، بیوی شوہر کو چھوڑ دیتی ہے اور شوہر بیوی

ہم نے زمانۂ قریب کی ملت سے کسی سے نہیں سنی۔[۹] یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات۔ کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص رہ گیا تھا جس پر اللہ کا ذکر نازل کر دیا گیا؟"
اصل بات یہ ہے کہ یہ میرے "ذکر" پر شک کر رہے ہیں،[۱۰] اور یہ ساری باتیں اس لیے

---

سے جدا ہو جاتا ہے، ہجرت کی نوبت آ جائے تو دامن جھاڑ کر وطن سے نکل کھڑا ہوتا ہے، کاروبار بیٹھ جاتے اور ساری برادری بائیکاٹ کر دے تو اسے بھی گوارا کر لیتا ہے، اور سخت سے سخت جسمانی اذیتیں بھی انگیز کر جاتا ہے، مگر اس کا کلمہ پڑھنے سے کسی طرح باز نہیں آتا۔

[۶] اشارہ ہے اُن سرداروں کی طرف جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سُن کر ابو طالب کی مجلس سے اُٹھ گئے تھے۔

[۷] یعنی حضورؐ کا یہ کہنا کہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے قائل ہو جاؤ تو عرب و عجم سب تمہارے تابع فرمان ہو جائیں گے۔

[۸] اُن کا مطلب یہ تھا کہ اس دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے، دراصل یہ دعوت اس غرض سے دی جا رہی ہے کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تابعِ فرمان ہو جائیں اور یہ ہم پر اپنا حکم چلائیں۔

[۹] یعنی قریب کے زمانے میں ہمارے اپنے بزرگ بھی گزرے ہیں، عیسائی اور یہودی بھی ہمارے ملک اور آس پاس کے ملکوں میں موجود ہیں، اور مجوسیوں سے ایران و عراق اور مشرقی عرب بھرا پڑا ہے کسی نے بھی ہم سے یہ نہیں کہا کہ انسان بس ایک اللہ رب العالمین کو مانے اور دوسرے کسی کو نہ مانے۔ آخر ایک اکیلے خدا پر کون اکتفا کرتا ہے۔ اللہ کے پیاروں کو تو سب ہی مان رہے ہیں۔ اُن کے آستانوں پر جا کر ماتھے رگڑ رہے ہیں۔ نذریں اور نیازیں دے رہے ہیں۔ دعائیں مانگ رہے ہیں۔ کہیں سے اولاد ملتی ہے۔ کہیں سے رزق ملتا ہے۔ کسی آستانے پر جو مراد مانگو بر آتی ہے۔ اُن کے تصرفات کو ایک دنیا مان رہی ہے اور اُن سے فیض پانے والے بتا رہے ہیں کہ اِن درباروں سے لوگوں کی کس کس طرح مشکل کشائی و حاجت روائی ہوتی ہے۔ اب اِس شخص سے ہم یہ نرالی بات سُن رہے ہیں، جو کبھی کسی سے نہ سُنی تھی، کہ ان میں سے کسی کا بھی خدائی میں کوئی حصہ نہیں اور پوری کی پوری خدائی بس

کر رہے ہیں کہ انہوں نے میرے عذاب کا مزا چکھا نہیں ہے۔ کیا تیرے داتا اور غالب پروردگار
کی رحمت کے خزانے اِن کے قبضے میں ہیں؟ کیا یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کے
مالک ہیں؟ اچھا تو یہ عالمِ اسباب کی بلندیوں پر چڑھ کر دیکھیں![۱۱]
یہ تو جتھوں میں سے ایک چھوٹا سا جتھا ہے جو اسی جگہ شکست کھانے والا ہے[۱۲]

---

ایک اکیلے اللہ ہی کی ہے۔

۱۰ بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، یہ لوگ دراصل تمہیں نہیں جھٹلا رہے ہیں بلکہ مجھے جھٹلا رہے ہیں۔ تمہاری صداقت پر تو پہلے کبھی انہوں نے شک نہیں کیا تھا۔ آج یہ شک جو کیا جا رہا ہے یہ دراصل میرے "ذکر" کی وجہ سے ہے۔ میں نے ان کو نصیحت کرنے کی خدمت جب تمہارے سپرد کی تو یہ اُسی شخص کی صداقت میں شک کرنے لگے جس کی راستبازی کی پہلے قسمیں کھایا کرتے تھے۔ یہی مضمون سورۂ انعام آیت ۳۳ میں بھی گزر چکا ہے (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، ص ۵۳۴)

۱۱ یہ کفار کے اِس قول کا جواب ہے کہ "کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص رہ گیا تھا جس پر اللہ کا ذکر نازل کر دیا گیا"۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ نبی ہم کس کو بنائیں اور کسے نہ بنائیں اس کا فیصلہ کرنا ہمارا اپنا کام ہے۔ یہ لوگ آخر کب سے اس فیصلے کے مختار ہو گئے۔ اگر یہ اس کے مختار بننا چاہتے ہیں تو کائنات کی فرمانروائی کے منصب پر قبضہ کرنے کے لیے عرش پر پہنچنے کی کوشش کریں تاکہ جسے یہ اپنی رحمت کا مستحق سمجھیں اُس پر وحی نازل ہو اور جسے ہم مستحق سمجھتے ہیں اس پر وہ نازل نہ ہو۔ یہ مضمون متعدد مقامات پر قرآن مجید میں بیان ہوا ہے، کیونکہ کفارِ قریش بار بار کہتے تھے کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیسے نبی بن گئے، کیا خدا کو قریش کے بڑے بڑے سرداروں میں سے کوئی اس کام کے لیے نہ ملا تھا (ملاحظہ ہو سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۱۰۰۔ الزخرف، آیات ۳۱-۳۲)

۱۲ "اسی جگہ" کا اشارہ مکہ معظمہ کی طرف ہے یعنی جہاں یہ لوگ یہ باتیں بنا رہے ہیں، اسی جگہ ایک دن یہ شکست کھانے والے ہیں اور یہیں وہ وقت آنے والا ہے جب یہ منہ لٹکائے اُسی

اس سے پہلے نوح کی قوم، اور عاد، اور میخوں والا فرعون[۱۳] ، اور ثمود، اور قوم لوط، اور ایکہ والے جھٹلا چکے ہیں۔ جتھے وہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا اور میری عقوبت کا فیصلہ اس پر چسپاں ہو کر رہا ع یہ لوگ بھی بس ایک دھماکے کے منتظر ہیں جس کے بعد کوئی دوسرا دھماکا نہ ہوگا[۱۴]۔ اور یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب، یوم الحساب سے پہلے ہی ہمارا حصہ ہمیں جلدی سے دے دے[۱۵]

---

شخص کے سامنے کھڑے ہونگے جسے آج یہ حقیر سمجھ کر نبی تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔

[۱۳] فرعون کے لیے "ذی الاوتاد" (میخوں والا) یا تو اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے کہ اس کی سلطنت ایسی مضبوط تھی گویا میخ زمین میں ٹھکی ہوئی ہو۔ یا اس بنا پر کہ اس کے کثیر التعداد لشکر جہاں ٹھیرتے تھے وہاں ہر طرف خیموں کی میخیں ہی میخیں ٹھکی نظر آتی تھیں۔ یا اس بنا پر کہ وہ جس سے ناراض ہوتا تھا اسے میخیں ٹھونک کر عذاب دیا کرتا تھا۔ اور ممکن ہے کہ میخوں سے مراد اہرامِ مصر ہوں جو زمین کے اندر میخ کی طرح ٹھکے ہوتے ہیں۔

[۱۴] یعنی عذاب کا ایک ہی کڑکا انہیں ختم کر دینے کے لیے کافی ہوگا کسی دوسرے کڑکے کی حاجت پیش نہ آئے گی۔ دوسرا مفہوم اس فقرے کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد پھر انہیں کوئی افاقہ نصیب نہ ہوگا، اتنی دیر کی بھی مہلت نہ ملے گی جتنی دیر اونٹنی کا دودھ نچوڑتے وقت ایک دفعہ سونتے ہوتے تھن میں دوبارہ سونتنے تک دودھ اُترنے میں لگتی ہے۔

[۱۵] یعنی اللہ کے عذاب کا حال تو ہے وہ جو ابھی بیان کیا گیا، اور ان نادانوں کا حال یہ ہے کہ یہ نبی سے مذاق کے طور پر کہتے ہیں کہ جس یوم الحساب سے تم ہمیں ڈراتے ہو اُس کے آنے تک ہمارے معاملے کو نہ ٹالو بلکہ ہمارا حساب ابھی چکوا دو، جو کچھ بھی ہمارے حصے کی شامت لکھی ہے وہ فوراً ہی آ جائے۔

---

# خلافت اور اسکے متعلقہ مسائل میں امام ابو حنیفہؒ کا مسلک

ابو الاعلیٰ مودودی

[گذشتہ دو اشاعتوں میں خلافت کے متعلق استاذ ابو زہرہ کے جس مضمون کا ترجمہ درج کیا گیا ہے اس میں دوسرے ائمہ اہلِ سنّت کا مسلک تو انہوں نے بخوبی بیان کر دیا ہے لیکن امام ابو حنیفہ کے مسلک کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کیا۔ حالانکہ اس مسئلے میں امام موصوف ایک ایسی مفصل رائے رکھتے تھے جو ریاست و امارت کے قریب قریب ہر پہلو پر حاوی تھی اور دوسرے ائمہ سے بعض بنیادی امور میں مختلف بھی تھی۔ اس کسر کو پورا کرنے کے لیے یہاں امام موصوفؒ کے مسلک کی وضاحت کی جا رہی ہے]

ریاست کا خواہ کوئی نظریہ بھی زیرِ بحث ہو، اس میں اوّلین سوال یہ ہوتا ہے کہ وہ نظریہ حاکمیت کس کے لیے ثابت کرتا ہے۔ اس حاکمیت کے باب میں امام ابو حنیفہ کا نظریہ وہی تھا جو اسلام کا مسلّم بنیادی نظریہ ہے، یعنی اصل حاکم خدا ہے، رسول اس کے نمائندے کی حیثیت سے مُطاع ہیں، اور خدا و رسول کی شریعت وہ قانونِ برتر ہے جس کے مقابلے میں اطاعت و اتباع کے سوا اور کوئی طرزِ عمل اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ امام اصلاً ایک قانونی آدمی تھے اس لیے انہوں نے اس مضمون کو علمِ سیاست کے بجائے قانون کی زبان میں بیان کیا ہے:

"مجھے جب کوئی حکم خدا کی کتاب میں مل جاتا ہے تو میں اسی کو تھام لیتا ہوں۔ اور جب اس میں نہیں ملتا تو رسول اللہ کی سنّت اور آپ کے اُن صحیح آثار کو لیتا ہوں جو ثقہ لوگوں کے ہاں ثقہ لوگوں کے واسطے سے معروف ہیں۔ پھر جب نہ کتاب اللہ میں حکم ملتا ہے نہ سنّت رسول اللہ میں تو میں اصحابِ رسول کے قول (یعنی ان کے

اجماع) کی پیروی کرتا ہوں، اور (ان کے اختلاف کی صورت میں) جس صحابی کا قول چاہتا ہوں قبول کرتا ہوں اور جس کا چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں، مگر ان سب کے اقوال سے باہر جا کر کسی کا قول نہیں لیتا۔ . . . . رہے دوسرے لوگ تو جس طرح اجتہاد کا انہیں حق ہے مجھے بھی حق ہے۔"

ابنِ حزم کا بیان ہے:

"تمام اصحابِ ابو حنیفہ اس پر متفق ہیں کہ ابو حنیفہ کا مذہب یہ تھا کہ ضعیف حدیث بھی اگر مل جائے تو اس کے مقابلے میں قیاس اور رائے کو چھوڑ دیا جائے۔"[۲]

اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ وہ قرآن اور سنت کو آخری سند (FINAL AUTHORITY) قرار دیتے تھے، اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ قانونی حاکمیت (LEGAL SOVEREIGNTY) خدا اور اس کے رسول کی ہے، اور اُن کے نزدیک قیاس و رائے سے قانون سازی کا دائرہ صرف ان حدود تک محدود تھا جن میں خدا اور رسول کا کوئی حکم موجود نہ ہو۔ صحابۂ رسول کے انفرادی اقوال کو دوسروں کے اقوال پر جو ترجیح وہ دیتے تھے اس کی وجہ بھی دراصل یہ تھی کہ صحابی کے معاملہ میں یہ امکان موجود ہے کہ اس کے علم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حکم ہو اور وہی اس کے قول کا ماخذ ہو۔ اسی لیے امام ابو حنیفہؒ اس بات کا التزام کرتے تھے کہ جن مسائل میں صحابہ کے درمیان اختلاف ہوا ہے ان میں کسی صحابی کے قول ہی کو اختیار کریں اور اپنی رائے سے کوئی ایسا فیصلہ نہ کریں جو تمام صحابیوں کے اقوال سے مختلف ہو۔ کیونکہ اس میں نادانستہ سنت کی خلاف ورزی ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ البتہ وہ قیاس سے یہ رائے قائم کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ ان میں سے کس کا قول سنت سے قریب تر ہو سکتا ہے۔ اگرچہ امام پر ان کے زمانۂ حیات ہی میں یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ قیاس کو نص پر ترجیح دیتے ہیں مگر انہوں نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا:

---

[۱] الخطیب البغدادی، تاریخ بغداد، ج ۱۳، ص ۳۶۸۔ المکی، مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ، ج ۱، ص ۸۹۔ الذہبی، مناقب الامام ابی حنیفہ وصاحبیہ ص ۲۰ [۲] الذہبی، ص ۲۱

"بخدا اُس شخص نے جھوٹ کہا اور ہم پر افترا کیا جس نے کہا کہ ہم قیاس کو نص پر مقدم رکھتے ہیں۔ بھلا نص کے بعد بھی قیاس کی کوئی حاجت رہتی ہے؟"[۳]

خلیفہ المنصور نے ایک مرتبہ ان کو لکھا کہ مَیں نے سُنا ہے آپ قیاس کو حدیث پر مقدم رکھتے ہیں۔ انہوں نے جواب میں لکھا:

"امیرالمومنین، جو بات آپ کو پہنچی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ میں سب سے پہلے کتاب اللہ پر عمل کرتا ہوں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر، پھر ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم کے فیصلوں پر، پھر باقی صحابہ کے فیصلوں پر، البتہ جب ان میں اختلاف ہو تو قیاس کرتا ہوں"[۴]

**خلافت کے انعقاد کا صحیح طریقہ** خلافت کے متعلق امام ابوحنیفہ کی رائے یہ تھی کہ پہلے بزور اقتدار پر قبضہ کرنا اور بعد میں دباؤ کے تحت بیعت لینا اس کے انعقاد کی کوئی جائز صورت نہیں ہے۔ صحیح خلافت وہ ہے جو اہل الرائے لوگوں کے اجتماع اور مشورے سے قائم ہو۔ اس رائے کو انہوں نے ایک ایسے نازک موقع پر بیان کیا جبکہ اسے زبان پر لانے والے کا سر اس کی گردن پر باقی رہنے کا احتمال نہ تھا۔ المنصور کے حاجب رَبیع بن یونس کا بیان ہے کہ منصور نے امام مالک، ابن ابی ذِئب اور امام ابوحنیفہ کو بلایا اور ان سے کہا "یہ حکومت جو اللہ تعالیٰ نے اس امت میں مجھے عطا کی ہے اس کے متعلق آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟ کیا میں اس کا اہل ہوں؟" امام مالک نے کہا "اگر آپ اس کے اہل نہ ہوتے تو اللہ اسے آپ کے سپرد نہ کرتا"۔ ابن ابی ذئب نے کہا "دنیا کی بادشاہی اللہ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے، مگر آخرت کی بادشاہی اسی کو دیتا ہے جو اس کا طالب ہو اور جسے اللہ اس کی توفیق دے۔ اللہ کی توفیق آپ سے قریب ہو گی اگر آپ اس کی اطاعت کریں۔ ورنہ اس کی نافرمانی کی صورت میں وہ آپ سے دُور رہے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ خلافت اہل تقویٰ کے

---

۳۔ الشعرانی، کتاب المیزان، ج ۱، ص ۶۱، المطبعۃ الازہریہ، مصر، طبع ثالث، ۱۹۲۵ء

۴۔ ایضاً، ص ۶۲۔

اجماع سے قائم ہوتی ہے۔ اور جو شخص خود اس پر قبضہ کرلے اس کے لیے کوئی تقویٰ نہیں ہے۔ آپ اور آپ کے مددگار توفیق سے خارج اور حق سے منحرف ہیں۔ اب اگر آپ اللہ سے سلامتی مانگیں اور پاکیزہ اعمال سے اس کا تقرب حاصل کریں تو یہ چیز آپ کو نصیب ہوگی ورنہ آپ خود ہی اپنے مطلوب ہیں۔"

امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ جس وقت ابن ابی ذئب یہ باتیں کہہ رہے تھے، میں نے اور مالک نے اپنے کپڑے سمیٹ لیے کہ شاید ابھی ان کی گردن اڑا دی جائے گی اور ان کا خون ہمارے کپڑوں پر پڑے گا۔ اس کے بعد منصور امام ابوحنیفہ کی طرف متوجہ ہوا اور بولا آپ کیا کہتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا "اپنے دین کی خاطر راہ راست تلاش کرنے والا غصے سے دور رہتا ہے۔ اگر آپ اپنے ضمیر کو ٹٹولیں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ آپ نے ہم لوگوں کو اللہ کی خاطر نہیں بلایا ہے بلکہ آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے ڈر سے آپ کے منشا کے مطابق بات کہیں اور وہ عوام کے علم میں آجائے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ آپ اس طرح خلیفہ بنے ہیں کہ آپ کی خلافت پر اہلِ فتویٰ لوگوں میں سے دو آدمیوں کا اجماع بھی نہیں ہوا، حالانکہ خلافت مسلمانوں کے اجتماع اور مشورے سے ہوتی ہے۔ دیکھیے، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ چھ مہینے تک فیصلے کرنے سے رکے رہے جب تک کہ اہلِ یمن کی بیعت نہ آگئی۔" یہ باتیں کرکے تینوں صاحب اٹھ گئے۔ پیچھے منصور نے ربیع کو تین توڑے درہموں کے دے کر ان تینوں اصحاب کے پاس بھیجا اور اس کو ہدایت کی کہ اگر مالک لے لیں تو ان کو دے دینا، لیکن اگر ابوحنیفہ اور ابن ابی ذئب انہیں قبول کریں تو ان کا سر اتار لانا۔ امام مالک نے یہ عطیہ لے لیا۔ ابن ابی ذئب کے پاس جب ربیع پہنچا تو انہوں نے کہا میں اس مال کو خود منصور کے لیے بھی حلال نہیں سمجھتا، اپنے لیے کیسے حلال سمجھوں۔ ابوحنیفہ نے کہا خواہ میری گردن ہی کیوں نہ مار دی جائے میں اس مال کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ منصور نے یہ رُوداد سن کر کہا "اس بے نیازی نے ان دونوں کا خون بچا دیا"[۵]

اہلیتِ خلافت کی شرائط: امام ابوحنیفہ کے زمانے تک اہلیتِ خلافت کی شرطیں اس تفصیلی طریقے سے بیان نہیں کی جاتی تھیں جس طرح بعد کے محققین، ماوردی اور ابن خلدون وغیرہ نے انہیں بیان کیا ہے۔

---

[۵] الکردری، مناقب الامام الاعظم، ج ۲، ص ۱۵-۱۶

کیونکہ ان میں سے اکثر اس وقت گویا بلا بحث مسلّم تھیں۔ مثلاً آدمی کا مسلمان ہونا، مرد ہونا، آزاد ہونا، ذی علم ہونا، سلیم الحواس اور سلیم الاعضاء ہونا۔ البتہ دو چیزیں ایسی تھیں جو اس زمانے میں زیر بحث آچکی تھیں اور جن کے متعلق صراحت مطلوب تھی۔ ایک یہ کہ ظالم و فاسق جائز خلیفہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ خلافت کے لیے قرشی ہونا ضروری ہے یا نہیں۔

**فاسق و ظالم کی امامت** پہلی چیز کے متعلق امام کی رائے کے دو پہلو ہیں جن کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ جس زمانے میں انہوں نے اس مسئلے پر اظہارِ خیال فرمایا ہے، وہ عراق میں خصوصاً، اور دنیائے اسلام میں عموماً، دو انتہا پسندانہ نظریات کی سخت کشمکش کا زمانہ تھا۔ ایک طرف نہایت زور شور سے کہا جا رہا تھا کہ ظالم و فاسق کی امامت قطعی ناجائز ہے اور اس کے تحت مسلمانوں کا کوئی اجتماعی کام بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف کہا جا رہا تھا کہ ظالم و فاسق خواہ کسی طرح بھی ملک پر قابض ہو جائے، اس کا تسلط قائم ہو جانے کے بعد اس کی امامت و خلافت بالکل جائز ہو جاتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان امام اعظم نے ایک نہایت متوازن نظریہ پیش کیا جس کی تفصیل یہ ہے۔

الفقہ الاکبر میں وہ فرماتے ہیں:

"مومنوں میں سے ہر نیک و بد کے پیچھے نماز جائز ہے[۵]"۔

اور عقیدۂ طحاویہ میں امام طحاوی اس حنفی مسلک کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اور حج و جہاد مسلمانوں کے اولی الامر کے ماتحت، قیامت تک جاری رہیں گے، خواہ وہ نیک ہوں یا بد۔ ان کاموں کو کوئی چیز باطل نہیں کرتی اور نہ ان کا سلسلہ منقطع کر سکتی ہے[۶]"۔

یہ اس مسئلے کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ امام کے نزدیک خلافت کے لیے عدالت شرط لازم ہے کوئی ظالم و فاسق آدمی جائز خلیفہ یا قاضی یا حاکم یا مفتی نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ بن بیٹھا ہو تو اس کی امامت باطل ہے اور لوگوں پر اس کی اطاعت لازم نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے

---

۵ ملا علی قاری، شرح الفقہ الاکبر، ص ۹۱

۶ ابن ابی العز الحنفی، شرح الطحاویہ، ص ۳۲۲

عملاً قابض و متصرف ہو جانے کے بعد مسلمان اس کے تحت اپنی اجتماعی زندگی کے جو کام صحیح شرعی طریقے سے انجام دیں گے وہ جائز ہوں گے۔ اور اس کے مقرر کیے ہوتے قاضی عدل کے ساتھ جو فیصلے کریں گے وہ نافذ ہو جائیں گے۔ اس مسئلے کو مذہب حنفی کے مشہور امام ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"پس جائز نہیں کہ کوئی ظالم نبی ہو یا نبی کا خلیفہ، یا قاضی، یا کوئی ایسا منصب دار جس کی بنا پر امور دین میں اس کی بات قبول کرنا لوگوں پر لازم آتا ہو، مثلاً مفتی یا شاہد یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کرنے والا۔ آیت لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِينَ[۵۸] اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ دین کے معاملات میں جن لوگوں کو بھی پیشوائی کا مقام حاصل ہو ان کا عادل اور صالح ہونا شرط ہے . . . اس آیت سے یہ ثابت ہے کہ فاسق کی امامت باطل ہے، وہ خلیفہ نہیں ہو سکتا، اور اگر کوئی شخص اپنے آپ کو خود اس منصب پر قائم کر لے، درانحالیکہ وہ فاسق ہو، تو لوگوں پر اس کا اتباع اور اس کی اطاعت لازم نہیں یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے کہ خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہے۔ اور یہ آیت اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ فاسق حاکم (جج اور مجسٹریٹ) نہیں ہو سکتا، اور اگر وہ حاکم ہو جائے تو اس کے احکام نافذ نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح اس کی نہ شہادت مقبول ہے، نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی روایت قبول کی جا سکتی ہے، اور نہ اس کا فتویٰ مانا جا سکتا ہے اگر وہ مفتی ہو"[۵۹]

آگے چل کر الجصاص اس امر کی تصریح کرتے ہیں کہ یہی امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے، اور پھر تفصیل کے ساتھ بتاتے ہیں کہ ابوحنیفہ پر یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ انہیں فاسق کی امامت جائز قرار

---

[۵۸] "میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا" (قرآن، البقرہ: ۱۲۴)

[۵۹] ج ۱، ص ۸۰

دینے کا الزام دیا جاتا ہے :۔

"بعض لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ ابوحنیفہ کے نزدیک فاسق کی امامت وخلافت جائز ہے ۔ ۔ ۔ یہ بات اگر قصداً جھوٹ نہیں کہی گئی ہے تو ایک غلط فہمی ہے ، اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ابوحنیفہ کہتے ہیں ، اور صرف ابوحنیفہ ہی نہیں ، فقہائے عراق میں سے جن جن لوگوں کے اقوال معروف ہیں وہ سب یہی کہتے ہیں کہ قاضی اگر خود عادل ہو تو خواہ وہ کسی ظالم امام ہی کا مقرر کیا ہوا ہو ، اس کے فیصلے صحیح طور پر نافذ ہو جائیں گے ۔ اور نماز ان فاسق اماموں کے پیچھے بھی ، ان کے فسق کے باوجود جائز ہو گی ۔ یہ مسلک اپنی جگہ بالکل صحیح ہے ۔ مگر اس سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ ابوحنیفہ فاسق کی امامت کو جائز ٹھیراتے ہیں[۱۰]"

امام ذہبی اور الموفق المکی ، دونوں ، امام ابوحنیفہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں :

"جو امام فئے (یعنی پبلک کے خزانے) کا ناجائز استعمال کرے ، یا حکم میں ظلم سے کام لے اس کی امامت باطل ہے اور اس کا حکم جائز نہیں ہے[۱۱]"

ان بیانات پر غور کرنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ امام ابوحنیفہ خوارج اور معتزلہ کے برعکس ، بالحق ( DE JURE ) اور بالفعل ( DE FACTO ) میں فرق کرتے ہیں ۔ خوارج و معتزلہ کے مسلک سے لازم آتا تھا کہ اگر امام عادل و صالح ، یعنی امام بالحق موجود نہ ہو تو مسلم معاشرے اور ریاست کا پورا نظام معطل ہو جائے ۔ نہ حج ہو سکے ، نہ جمعہ و جماعت ہو ، نہ عدالتیں قائم ہوں ، نہ مسلمانوں کا کوئی مذہبی کام ، یا سیاسی و معاشرتی کام جائز طور پر انجام پاتے ۔ امام ابوحنیفہ اس غلطی کی اصلاح یوں کرتے ہیں کہ بالحق امام اگر میسر نہ ہو تو بالفعل جو بھی مسلمانوں کا

---

[۱۰] احکام القرآن ج ۱، ص ۸۰ - ۸۱ ۔ شمس الائمہ سرخسی نے المبسوط میں بھی امام ابوحنیفہ کا یہی مسلک بیان کیا ہے ۔ ج ۱۰، ص ۱۳۰

[۱۱] الذہبی ، مناقب الامام ابی حنیفہ وصاحبیہ ، ص ۱۷ ۔ المکی ، مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ ، ج ۲، ص ۱۰۰ ۔

امام ہو اس کے ماتحت مسلمانوں کی پوری اجتماعی زندگی کا نظام جائز طور پر چلتا رہے گا، خواہ بجائے خود اس امام کی امامت جائز نہ ہو۔

معتزلہ و خوارج کی اس انتہا پسندی کے مقابلہ میں جو دوسری انتہا مُرجئہ، اور خود اہلِ سنت کے بعض ائمہ نے اختیار کی تھی، امام ابوحنیفہ نے مسلمانوں کو اُس سے اور اُس کے نتائج سے بھی بچایا ہے۔ وہ لوگ بھی بالفعل اور بالحق کے درمیان خلط ملط کر گئے تھے اور انہوں نے فاسق کی بالفعل امامت کو اس انداز سے جائز ٹھیرایا تھا کہ گویا وہی بالحق بھی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ مسلمان ظالم و جابر اور بدکردار فرمانرواؤں کی حکومت پر مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں، اور اسے بدلنے کی کوشش تو درکنار، اس کی فکر تک چھوڑ دیں۔ امام ابوحنیفہ نے اس غلط خیال کی اصلاح کے لیے پُورے زور سے اس حقیقت کا اعلان و اظہار کیا کہ ایسے لوگوں کی امامت قطعاً باطل ہے۔

خلافت کے لیے قرشیت کی شرط | دوسرے مسئلے کے بارے میں امام ابوحنیفہ کی رائے یہ تھی کہ خلیفہ قریش ہی میں سے ہونا چاہیے[۱۲] اور یہ صرف انہی کی نہیں، تمام اہلِ سنّت کی متفق علیہ رائے تھی[۱۳]۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اسلامی خلافت ازروئے شریعت صرف ایک قبیلے کا دستوری حق تھی، بلکہ اس کی اصل وجہ اُس وقت کے حالات تھے جن میں مسلمانوں کو مجتمع رکھنے کے لیے خلیفہ کا قرشی ہونا ضروری تھا۔ ابنِ خلدون نے یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کی ہے کہ اس وقت اسلامی ریاست کی اصل پشت پناہ عرب تھے، اور عربوں کا زیادہ سے زیادہ اتفاق اگر ممکن تھا تو قریش ہی کی خلافت پر۔ دوسرے کسی گروہ کا آدمی لینے کی صورت میں تنازع اور افتراق کے امکانات اتنے زیادہ تھے کہ خلافت کے نظام کو اس خطرے میں ڈالنا مناسب نہ تھا[۱۴]۔ اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱۲] المسعودی، ج ۲، ص ۱۹۲

[۱۳] الشہرستانی، کتاب الملل والنحل، ج ۱، ص ۱۰۶۔ عبدالقاہر بغدادی، الفرق بین الفرق، ص ۳۴۰

[۱۴] مقدمہ، ص ۱۹۵ - ۱۹۶

نے ہدایت کی تھی کہ "امام قریش میں سے ہوں"[۱۵]۔ ورنہ اگر یہ منصب غیر قریشی کے لیے شرعاً ممنوع ہوتا تو حضرت عمرؓ اپنی وفات کے وقت یہ نہ کہتے کہ اگر حذیفہ کے آزاد کردہ غلام سالم زندہ ہوتے تو میں ان کو اپنا جانشین تجویز کرتا[۱۶]۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی قریش میں خلافت رکھنے کی ہدایت دیتے ہوتے یہ بات واضح کر دی تھی کہ یہ منصب ان کے اندر اس وقت تک رہے گا جب تک ان میں مخصوص صفات باقی رہیں گی[۱۷]۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان صفات کے فقدان کی صورت میں خلافت غیر قریش کے لیے بھی ہو سکتی ہے۔ یہی اصل فرق ہے امام ابو حنیفہ اور جمیع اہل السنت کے مسلک اور ان خوارج و معتزلہ کے مسلک میں جو مطلقاً غیر قریشی کے لیے خلافت کا جواز ثابت کرتے تھے بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر غیر قریشی کو خلافت کا زیادہ حق دار قرار دیتے تھے۔ اُن کی نگاہ میں اصل اہمیت جمہوریت کی تھی خواہ اس کا نتیجہ انتشار ہی کیوں نہ ہو۔ مگر اہل السنت والجماعت کو جمہوریت کے ساتھ ریاست کے استحکام کی بھی فکر تھی۔

**بیت المال** اپنے وقت کے خلفاء کی جن باتوں پر امام سب سے زیادہ معترض تھے ان میں سے ایک سرکاری خزانے پر ان کے بے جا تصرفات اور لوگوں کی املاک پر ان کی دست درازیاں تھیں۔ ان کے نزدیک حکم میں جور اور بیت المال میں غلول و خیانت، ایک امام کی امامت کو باطل کر دینے والے افعال تھے جیسا کہ ہم اوپر الذہبی کے حوالہ سے نقل کر چکے ہیں۔ وہ اس کو بھی جائز نہ رکھتے تھے کہ بیرونی ممالک سے جو ہدیے اور تحفے خلیفہ کے پاس آئیں ان کو وہ اپنی ذاتی ملک بنا لے۔ ان کے نزدیک یہ چیزیں پبلک کے خزانے کا حق تھیں نہ کہ خلیفہ اور اس کے خاندان کا، کیونکہ وہ اگر مسلمانوں کا خلیفہ نہ ہوتا اور بین الاقوامی دنیا میں ان کی اجتماعی قوت و سعی کی بدولت اس کی دھاک قائم نہ ہوئی ہوتی تو کوئی اس شخص کو گھر بیٹھے ہدیے نہ بھیجتا[۱۸]۔ وہ بیت المال سے خلیفہ کے

---

۱۵؎ ابن حجر، فتح الباری، ج ۱۳، ص ۹۳، ۹۶، ۹۷۔ مسند احمد، ج ۳، ص ۱۲۹، ۱۸۳، ج ۴، ص ۴۲۱، المطبعۃ المیمنیہ مصر ۱۳۰۶ھ۔ مسند ابوداؤد الطیالسی، حدیث نمبر ۹۲۶، ۲۱۳۳، طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۳۲۱ھ

۱۶؎ الطبری، ج ۳، ص ۱۹۲ ۱۷؎ ابن حجر، فتح الباری، ج ۱۳، ص ۹۵ ۱۸؎ السرخسی، شرح السیر الکبیر، ج ۱، ص ۹۸

بے جا مصارف اور عطیات پر بھی معترض تھے، اور یہ ان وجوہ میں سے ایک بڑی وجہ تھی جن کی بنا پر وہ خود خلفاء کے عطیے قبول نہ کرتے تھے۔ جس زمانہ میں ان کے اور خلیفہ منصور کے درمیان سخت کشمکش چل رہی تھی، منصور نے ان سے کہا تم میرے ہدیے کیوں نہیں قبول کرتے؟ انہوں نے جواب دیا: "امیر المومنین نے اپنے مال میں سے مجھے کب دیا تھا کہ میں نے اسے رد کیا ہو؟ اگر آپ اس میں سے دیتے تو میں ضرور قبول کر لیتا۔ آپ نے تو مسلمانوں کے بیت المال سے مجھے دیا، حالانکہ ان کے مال میں میرا کوئی حق نہیں ہے۔ میں نہ ان کے دفاع کے لیے لڑنے والا ہوں کہ ایک سپاہی کا حصہ پاؤں، نہ ان کے بچوں میں سے ہوں کہ بچوں کا حصہ مجھے ملے، اور نہ فقراء میں سے ہوں کہ جو کچھ فقیر کو ملنا چاہیے وہ مجھے ملے"[۹]۔ پھر جب المنصور نے عہدۂ قضا قبول نہ کرنے پر انہیں ۳۰ کوڑے مارے اور ان کا سارا بدن لہولہان ہو گیا تو خلیفہ کے چچا عبد الصمد بن علی نے اس کو سخت ملامت کی کہ "یہ تم نے کیا کیا، اپنے اوپر ایک لاکھ تلواریں کھچوا لیں، یہ عراق کا فقیہ ہے، بلکہ یہ تمام اہلِ مشرق کا فقیہ ہے۔" منصور نے اس پر نادم ہو کر فی تازیانہ ایک ہزار درہم کے حساب سے ۳۰ ہزار درہم امام کو بھجوائے۔ لیکن انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ کہا گیا کہ لے کر خیرات کر دیجیے۔ جواب میں فرمایا "کیا ان کے پاس کوئی مال حلال بھی ہے؟"[۱۰] اسی کے قریب زمانے میں جب پے در پے تکلیفیں سہتے سہتے ان کا آخر وقت آ گیا تو انہوں نے وصیت کی کہ بغداد کے اس حصے میں انہیں دفن نہ کیا جائے جسے شہر بسانے کے لیے منصور نے لوگوں کی املاک میں سے غصب کر لیا تھا۔ منصور نے اس وصیت کا حال سنا تو چیخ اٹھا کہ "ابوحنیفہ، زندگی اور موت میں تیری پکڑ سے کون مجھے بچائے"[۱۱]۔

**عدلیہ کی انتظامیہ سے آزادی** | عدلیہ کے متعلق ان کی قطعی رائے یہ تھی کہ اسے انصاف کرنے

[۹] المکی، ج ۱، ص ۲۱۵

[۱۰] ایضاً، ص ۲۱۶ - ۲۱۵

[۱۱] ایضاً، ج ۲، ص ۱۸۰

کے لیے انتظامیہ کے دباؤ اور مداخلت سے نہ صرف آزاد ہونا چاہیے بلکہ قاضی کو اس قابل ہونا چاہیے کہ خود خلیفہ بھی اگر لوگوں کے حقوق پر دست درازی کرے تو وہ اس پر اپنا حکم نافذ کر سکے۔ چنانچہ اپنی زندگی کے آخری زمانے میں جبکہ امام کو یقین ہو گیا تھا کہ حکومت ان کو زندہ نہ رہنے دے گی، انہوں نے اپنے شاگردوں کو جمع کر کے ایک تقریر کی اور اس میں منجملہ دوسری اہم باتوں کے ایک بات یہ بھی فرمائی کہ:

"اگر خلیفہ کوئی ایسا جرم کرے جو انسانی حقوق سے متعلق ہو تو مرتبے میں اس سے قریب ترین قاضی (یعنی قاضی القضاۃ) کو اس پر حکم نافذ کرنا چاہیے[۲۲]"

بنی امیہ اور بنی عباس کے زمانہ میں حکومت کے مناصب، اور خصوصاً قضا کا عہدہ قبول کرنے سے ان کے انکار کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ ان دونوں حکومتوں میں قضاء کی یہ حیثیت نہ پاتے تھے۔ صرف یہی نہیں کہ خلیفہ پر قانون کا حکم نافذ کرنے کی وہاں کوئی گنجائش نہ تھی بلکہ انہیں اندیشہ تھا کہ انہیں آلۂ ظلم بنایا جائے گا، ان سے غلط فیصلے کرائے جائیں گے اور ان کے فیصلوں میں نہ صرف خلیفہ بلکہ اس کے قصر سے تعلق رکھنے والے دوسرے لوگ بھی مداخلت کریں گے۔

سب سے پہلے بنی امیہ کے عہد میں عراق کے گورنر یزید بن عمر بن ہُبَیرہ نے ان کو منصب قبول کرنے پر مجبور کیا۔ یہ ۱۳۰ھ کا زمانہ تھا جبکہ عراق میں اُموی سلطنت کے خلاف فتنوں کے وہ طوفان اٹھ رہے تھے جنہوں نے دو سال کے اندر اُمویوں کا تختہ اُلٹ دیا۔ اس موقع پر ابنِ ہُبَیرہ چاہتا تھا کہ بڑے بڑے فقہا کو ساتھ ملا کر ان کے اثر سے فائدہ اٹھائے۔ چنانچہ اس نے ابنِ ابی لیلیٰ، داؤد بن ابی الہند، ابن شُبرمہ وغیرہ کو بلا کر اہم مناصب دیے۔ پھر ابوحنیفہ کو بلا کر کہا کہ میں آپ کے ہاتھ میں اپنی مہر دیتا ہوں، کوئی حکم نافذ نہ ہو گا جب تک کہ آپ اس پر مہر نہ لگائیں اور کوئی مال خزانے سے نہ نکلے گا جب تک آپ اس کی توثیق نہ کریں۔ امام نے

---

[۲۲] المکی، ج ۲، ص ۱۰۰

یہ ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کیا تو اس نے انہیں قید کر دیا اور کوڑے لگوانے کی دھمکی دی۔ دوسرے فقہاء نے امام کو سمجھایا کہ اپنے اوپر رحم کرو، ہم سب اس خدمت سے ناخوش ہیں مگر مجبوراً اسے قبول کیا ہے، تم بھی مان لو۔ امام نے جواب دیا "اگر وہ مجھ سے چاہے کہ اس کے لیے واسط کی مسجد کے دروازے گنوں تب بھی میں قبول نہ کروں گا، کجا کہ وہ چاہتا ہے کہ وہ کسی آدمی کے قتل کا حکم لکھے اور میں اس فرمان پر مہر لگاؤں۔ خدا کی قسم، میں اس ذمہ داری میں شریک نہ ہوں گا۔" اس سلسلے میں ابن ہبیرہ نے ان کے سامنے اور خدمات پیش کیں اور وہ انکار کرتے رہے۔ پھر اس نے ان کو قاضی کوفہ بنانے کا فیصلہ کیا اور اس پر قسم کھائی کہ ابوحنیفہ انکار کریں گے تو میں انہیں کوڑے لگواؤں گا۔ ابوحنیفہ نے بھی جواب میں قسم کھائی اور کہا "دنیا میں اس کے کوڑے کھا لینا میرے لیے آخرت کی سزا بھگتنے سے زیادہ سہل ہے، خدا کی قسم میں ہرگز قبول نہ کروں گا، خواہ وہ مجھے قتل ہی کر دے۔" آخر کار اس نے ان کے سر پر ۲۰ یا ۳۰ کوڑے لگوائے۔ بعض روایات یہ ہیں کہ دس گیارہ روز تک وہ روزانہ دس کوڑے لگواتا رہا۔ مگر ابوحنیفہ اپنے انکار پر قائم رہے۔ آخر کار اسے اطلاع دی گئی کہ یہ شخص مر جائے گا۔ اس نے کہا کیا کوئی ناصح نہیں ہے جو اس شخص کو سمجھائے کہ مجھ سے مہلت ہی مانگ لے۔ امام ابوحنیفہ کو ابن ہبیرہ کی یہ بات پہنچائی گئی تو انہوں نے کہا مجھے چھوڑ دو کہ میں اپنے دوستوں سے اس معاملہ میں مشورہ کر لوں۔ ابن ہبیرہ نے یہ پیغام ملتے ہی انہیں چھوڑ دیا اور وہ کوفہ چھوڑ کر مکہ چلے گئے جہاں سے بنی امیہ کی سلطنت ختم ہونے تک وہ پھر نہ پلٹے۔[۲۳]

اس کے بعد عباسی عہد میں المنصور نے ان پر عہدۂ قضا کے لیے اصرار شروع کیا۔ جیسا کہ آگے چل کر ہم بتائیں گے، منصور کے خلاف نفس زکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم کے خروج میں امام نے کھلم کھلا ان کا ساتھ دیا تھا، جس کی وجہ سے منصور کے دل میں ان کے خلاف گرہ بیٹھی ہوئی تھی۔ الذہبی کے الفاظ میں وہ ان کے خلاف غصے میں آگ کے بغیر جلا جا رہا تھا۔[۲۴] مگر ان جیسے

[۲۳] المکی، ج ۲، ص ۲۱-۲۴۔ ابن خلکان، ج ۵، ص ۴۱۔ ابن عبدالبر، الانتقاء، ص ۱۷۱۔ [۲۴] مناقب الامام، ص ۳

با اثر آدمی پر ہاتھ ڈالنا اس کے لیے آسان نہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ایک امام حسین کے قتل نے بنی امیہ کے خلاف مسلمانوں میں کتنی نفرت پیدا کر دی تھی اور اس کی بدولت ان کا اقتدار کس آسانی سے اکھاڑ پھینکا گیا۔ اس لیے وہ انہیں مارنے کے بجائے سونے کی زنجیروں سے باندھ کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا زیادہ بہتر سمجھتا تھا۔ اس نے ان کے سامنے بار بار قضا کا منصب اسی نیت سے پیش کیا، یہاں تک کہ انہیں تمام سلطنت عباسیہ کا قاضی القضاۃ مقرر کرنے کی پیش کش کی۔ مگر وہ ایک مدت تک طرح طرح کے حیلوں سے اس کو ٹالتے رہے[۱۲۵]۔ آخر کار جب وہ بہت ہی زیادہ مصر ہوا تو امام نے اس کو صاف صاف اپنے انکار کے وجوہ بتائے۔ ایک مرتبہ کی گفتگو میں انہوں نے بڑے نرم انداز میں معذرت کرتے ہوئے کہا "قضا کے لیے نہیں موزوں ہو سکتا مگر وہ شخص جو اتنی جان رکھتا ہو کہ آپ پر اور آپ کے شاہزادوں اور سپہ سالاروں پر قانون نافذ کر سکے۔ مجھ میں یہ جان نہیں ہے۔ مجھے تو جب آپ بلاتے ہیں تو واپس نکل کر ہی میری جان میں جان آتی ہے[۱۲۶]۔" ایک اور موقع پر زیادہ سخت گفتگو ہوئی جس میں انہوں نے خلیفہ کو مخاطب کر کے کہا "خدا کی قسم میں تو اگر رضامندی سے بھی یہ عہدہ قبول کروں تو آپ کے بھروسے کے لائق نہیں ہوں، کجا کہ ناراضی کے ساتھ مجبوراً قبول کروں۔ اگر کسی معاملہ میں میرا فیصلہ آپ کے خلاف ہوا اور پھر آپ نے مجھے دھمکی دی کہ یا تو میں تجھے فرات میں غرق کر دوں گا ورنہ اپنا فیصلہ بدل دے، تو میں غرق ہو جانا قبول کر لوں گا مگر فیصلہ نہ بدلوں گا۔ پھر آپ کے بہت سے اہل دربار بھی ہیں ........ کوئی ایسا قاضی چاہیے جو آپ کی خاطر ان کا بھی لحاظ کرے[۱۲۷]۔" ان باتوں سے جب منصور کو تعین ہو گیا کہ یہ شخص اس سنہری پنجرے میں بند ہونے کے لیے تیار نہیں ہے تو وہ عریاں انتقام پر اتر آیا۔ انہیں کوڑوں سے پٹوایا، جیل میں ڈال کر کھانے پینے کی سخت تکلیفیں دیں، پھر ایک مکان میں نظر بند کر دیا جہاں بقول بعض طبعی موت سے اور بقول بعض زہر سے ان کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا[۱۲۸]۔

(باقی)

---

۱۲۵ المکی، ج ۲، ص ۱۷۲-۱۷۳ - ۱۸۰-۱۸۱۔ ۱۲۶ ایضاً، ج ۱، ص ۲۱۵۔ ۱۲۷ ایضاً، ج ۲، ص ۱۷۰۔ الخطیب، ج ۱۳، ص ۳۲۸۔

۱۲۸ المکی، ج ۲، ص ۱۷۳-۱۷۴-۱۸۲۔ ابن خلکان، ج ۵، ص ۴۶۔ الیافعی، مرآۃ الجنان، ص ۳۱۰۔

# خُطباتِ حَرَم

[اس سال حج کے موقع پر مجھ کو یہ شرف حاصل ہوا تھا کہ حج کے موضوع پر پاکستان و ہندوستان اور دوسرے ممالک سے آئے ہوئے اُن حجاج کو خطاب کروں جن کی زبان اُردو ہے۔ یہ تقریریں ۵-۶ اور ۷ ذی الحجہ کو نمازِ عصر کے بعد حرم پاک میں زمزم کے مقام پر کی گئی تھیں۔ ا۔م]

## پہلا خطبہ

حمد و ثنا کے بعد: برادرانِ اسلام! یہ ہم سب کی انتہائی خوش بختی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اپنے اس گھر کی زیارت کا شرف بخشا اور یہ موقع نصیب فرمایا کہ ہم یہاں حج کے لیے آئیں اور اُن "آیاتِ بیّنات"[1] کو دیکھیں جو اس سرزمین میں عموماً اور خانۂ کعبہ اور مسجدِ حرام میں خصوصاً نمایاں طور پر نظر آرہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں آکر ایک آدمی اگر کھلی آنکھوں سے دیکھے اور سمجھنے کی کوشش کرے تو اس کو ہر طرف اللہ کی نشانیاں ہی نشانیاں نظر آئیں گی جنہیں دیکھ کر اس کا دل ایمان سے بھر جائے گا۔

حضرات! آج سے چار ہزار برس پہلے یہ جگہ بالکل ایک سنسان وادی تھی۔ دنیا سے الگ تھلگ، اس ریگستان میں، ان پہاڑوں کے درمیان، اس وادی میں اللہ کا ایک بندہ آتا ہے اور ایک چار دیواری کھینچ کر اعلان کرتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے، اور دنیا بھر کو پکار دیتا ہے

---

[1] اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف جس میں اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کے متعلق فرمایا ہے کہ فِیْہِ اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ "اس میں روشن نشانیاں ہیں" (آل عمران - ۹۷)

کرآؤ اس کا حج کرو۔ اب دیکھیے آخر کیا بات ہے کہ چار ہزار برس سے دنیا بھر کے انسان اس پکار پر لبیک لبیک کہتے ہوئے اس گھر کی طرف کھچے چلے آرہے ہیں اور آج تک تاریخ میں ایک سال بھی ایسا نہیں گزرا ہے کہ اس کا حج اور اس کے گرد طواف نہ ہُوا ہو۔ کوئی دوسرا انسان ذرا ہمت کر کے کوئی جگہ بنا کر تو دیکھے اور اس کو قبلۂ عالم بنانے کے لیے اپنی سی پُوری کوشش کر کے دیکھ لے۔ اسے خود معلوم ہوجائے گا کہ کتنے انسان اس کی طرف کھچ کر آتے ہیں۔ یہ صریح علامت ہے اس بات کی کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے نبی تھے، انہوں نے فی الواقع اللہ تعالیٰ ہی کی مرضی اور اس کے حکم سے یہ گھر بنایا تھا۔ ان کے بناتے ہوئے اس گھر کو واقعی اللہ تعالیٰ نے شرفِ قبولیت عطا فرمایا ہے اور یہ بھی اللہ ہی کا حکم تھا جس کے تحت انہوں نے دنیا کو حج کی دعوتِ عام دی تھی۔ اسی وجہ سے اس گھر کو اور اس دعوتِ عام کو یہ کشش نصیب ہوئی کہ صدہا برس سے دنیا بھر کے انسان اس کی طرف کھچے چلے آرہے ہیں۔ قرآن مجید اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ وہ اللہ ہی تھا جس نے اس گھر کی تعمیر کے لیے اس جگہ کو منتخب فرمایا اور حضرت ابراہیم کو حکم دیا کہ اس کا حج کرنے کے لیے دنیا بھر کو پکار دیں:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ۔ (الحج: ۲۶-۲۷)

اور یاد کرو وہ وقت جب ہم نے ابراہیم کے لیے اس گھر کی جگہ تجویز کی تھی اس ہدایت کے ساتھ کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو، اور لوگوں کو حج کے لیے پکار دے کہ وہ آئیں تیرے پاس ہر دُور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار۔

حضرات! یہ اسی فرمانِ خداوندی کی برکت ہے کہ آج لاکھوں آدمی لبیک لبیک اللّھم لبیک کی صدائیں بلند کرتے ہوئے فوج در فوج یہاں آرہے ہیں اور پروانوں کی طرح اس خانۂ کعبہ کے گرد

گھوم رہے ہیں۔ یہ اُن آیات بیّنات میں سے اوّلین اور نمایاں ترین نشانی ہے جو اس گھر میں آپ دیکھ رہے ہیں۔

اب ذرا ایک اور نشانی ملاحظہ فرمایئے۔ اس گھر کی تعمیر جب ہوئی تھی اُسی وقت اللہ تعالیٰ نے اعلان فرما دیا تھا کہ ہم اسے لوگوں کا مرکز و مرجع ہی نہیں بلکہ امن کا گھر بھی بنا دیں گے۔ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا (البقرہ: ۱۲۵)۔ اس اعلان پر چار ہزار برس گزر چکے ہیں اور اس وقت سے آج تک یہ امن ہی کا گھر بنا ہوا ہے۔ نہ صرف یہ خود امن کا گھر ہے بلکہ جس شہر میں یہ واقع ہے وہ بھی امن کا شہر ہے اور اس کے گرد و پیش کئی کئی میل تک کا پورا رقبہ ایک ایسا حرم ہے جس کے اندر کسی نوعیت کی بدامنی نہیں ہو سکتی۔ آج روئے زمین پر اس حرم پاک کے سوا کوئی دوسرا گز بھر کا خطہ بھی ایسا نہیں پایا جاتا جسے اس معنی میں حرم ہونے کا شرف حاصل ہو، اور آج ہی نہیں کبھی دنیا میں کوئی دوسرا ایسا حرم نہیں پایا گیا ہے جس کا وہ احترام کیا گیا ہو جو اس حرم کا ہوا ہے۔ اس کی حرمت کا اندازہ آپ اس بات سے کیجیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تک ڈھائی ہزار برس کا زمانہ عرب کی سرزمین میں ایسا گزرا ہے جس میں یہ ملک نظم و آئین سے محروم تھا۔ یہاں کوئی حکومت نہ تھی۔ کوئی قانون نہ تھا۔ ہر طرف بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ قتل و خون اور غارت گری کا زور تھا۔ کسی کے لیے جان، مال اور عزت و آبرو کی امان نہ تھی۔ لیکن اس پورے ملک میں صرف یہ حرم پاک ہی ایک ایسا خطہ تھا جہاں ان ۲۵ صدیوں کے دوران میں کامل امن قائم رہا۔ عرب کے وہ لوگ جو شوقیہ خونریزی اور لوٹ مار کرتے تھے، جن کے قبائل میں سو سو برس تک مسلسل لڑائیاں ٹھنی رہتی تھیں اور پشت در پشت انتقام کا چکر چلتا رہتا تھا، ان کا بھی یہ حال تھا کہ اس حرم کے حدود میں پہنچتے ہی ان کے ہاتھ رک جاتے تھے، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اپنے باپ کے قاتل کو بھی یہاں پا لیتا تھا تو اس سے انتقام نہ لے سکتا تھا۔ یہ اس کے سوا اور کس چیز کا نتیجہ مانا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اس خطۂ پاک کو حرم اور امن کا گھر بنا دیا تھا۔ یہ اللہ جل شانہٗ کے فرمان ہی کی برکت تھی کہ مَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا "جو اس میں داخل ہوا وہ امن میں آگیا" (آل عمران ۹۷)

اللہ کی قدرت کے سوا دنیا میں کوئی طاقت اُس انتہائی بدنظمی اور طوائف الملوکی کے زمانے میں ڈھائی ہزار برس تک یہاں امن قائم نہیں رکھ سکتی تھی۔ اسی نشانی کی طرف اللہ تعالیٰ کفارِ قریش کو توجہ دلاتا ہے کہ :

| | |
|---|---|
| اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (عنکبوت - ۶۷) | کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے ایک پُرامن حرم بنا رکھا ہے۔ حالانکہ اِن کے گردو پیش لوگ اُچکے جا رہے ہیں ؟ |

اس سے بھی زیادہ بڑے پیمانے پر ایک اور نشانی ہے جو اس سرزمین میں پائی جاتی ہے آپ ذرا وسیع نگاہ سے عرب کی تاریخ اور عرب کے ملک پر ایک نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عربی قوم کا ایک قوم کی حیثیت سے باقی رہنا اور عربی زبان کا اس قوم کی زبان کی حیثیت سے زندہ رہ جانا بھی اسی بیت اللہ کی برکت کا نتیجہ ہے۔ دنیا میں آج کوئی ملک ایسا نہیں پایا جاتا، نہ کبھی پایا گیا ہے جس کا رقبہ تو اتنا وسیع ہو جتنا عرب کا ہے اور پھر اس پورے ملک میں ایک ہی زبان بولی جاتی ہو۔ اور دنیا میں کوئی ایسا ملک بھی نہ آج موجود ہے، نہ کبھی موجود رہا ہے جس میں چار ہزار برس سے ایک ہی زبان بولی جا رہی ہو۔ اتنی لمبی مدت میں زبانیں بدل کر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہیں، اور اتنے وسیع و عریض ملکوں میں ایک نہیں، بیسیوں، بلکہ سینکڑوں زبانیں بن جاتی ہیں خصوصیت کے ساتھ جس ملک میں ہزارہا برس تک بدامنی اور بدنظمی رہی ہو، اور جو ملک صدیوں قبائلی لڑائیوں کی آماجگاہ بنا رہا ہو، اس کے اندر تو یہ وحدت باقی رہ جانا بالکل ہی ایک عجوبہ ہے۔ لیکن یہ معجزہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت نے اس سرزمین میں کر کے دکھا دیا، اور اس کا ذریعہ بھی خانہ کعبہ اور یہی حج تھا۔

یہ خانۂ کعبہ اور یہ حج اس کا ذریعہ کیسے بنا؟ اس کی مختصر تشریح یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو مرکز و مرجع (مثابۃ للناس) بنایا اور حضرت ابراہیم کو حکم دیا کہ لوگوں کو اس کا حج کرنے کی دعوتِ عام دے دیں، تو اس کے ساتھ یہ بھی فیصلہ فرما دیا کہ سال میں چار مہینے (ذی القعدہ،

ذی الحجہ اور محرم حج کے لیے اور رجب عمرے کے لیے) حرام قرار دے دیئے جائیں۔ حکم دے دیا گیا کہ ان چار مہینوں میں لڑائی بند رہے، حج اور عمرے کے لیے آنے جانے والوں کو کوئی نہ چھیڑے، اور اُن جانوروں پر بھی کوئی ہاتھ نہ ڈالے جو قربانی کے لیے بیت اللہ کی طرف لائے جا رہے ہوں۔ یہ حکم صرف ایک بندۂ خدا کی زبان سے ادا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی حکومت نہ تھی۔ اس کے پاس کوئی فوج، پولیس یا عدالت نہ تھی کہ اس کے زور سے وہ اس قانون کو جاری کرتا۔ مگر اس کی پشت پر اللہ رب العالمین کی طاقت تھی جس کے زور سے یہ حکم نافذ ہوا اور عرب کے باشندے نسلاً بعد نسلٍ اس کی پیروی کرتے چلے گئے۔

اس حکم کی برکت یہ تھی کہ عرب کی سرزمین کو ہر سال چار مہینے امن و امان کے میسر آجاتے تھے جن سے فائدہ اٹھا کر ملک کے ہر گوشے سے قافلے بیت اللہ کی طرف آتے تھے، قبائل کے لوگ ایک دوسرے سے ملتے تھے، آزادانہ تجارت ہوتی تھی، میلے لگتے تھے، شاعری اور خطابت کے مقابلے ہوتے تھے، اور عرب کے دوسرے حصّوں میں بھی قافلوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ اس طرح عربوں میں ایک قوم ہونے کا احساس زندہ رہا۔ ان کی زبان محفوظ رہی اور وہ تمام عربوں کی ایک ہی زبان بنی رہی۔ ان کی ثقافت اور ان کی روایات باقی رہیں۔ اور یہ قوم کٹ کٹ کر مر جانے سے بچ گئی۔ یہ سب کچھ اسی گھر کا صدقہ اور اسی حج کا کرشمہ ہے۔ اسی کی بدولت ایک قوم مرنے سے بچی، ایک زبان مٹنے سے بچی اور ایک ملک کے اندر ایک ہی زبان اور ایک ہی تہذیب برقرار رہی۔ یہ گھر نہ ہوتا اور یہ حج نہ ہوتا تو ہزاروں برس کی بدامنی و بدنظمی اور طوائف الملوکی سے عرب قوم اور عربی زبان اور عربی ثقافت کبھی کی مٹ چکی ہوتی۔

ایک اور نشانی ملاحظہ ہو۔ جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں اپنی ایک بیوی اور ایک بچے کو لاکر چھوڑا تھا اُس وقت یہاں کوئی شہر تو درکنار برائے نام کوئی چھوٹا سا گاؤں تک نہ تھا۔ اس حالت میں ان کی زبانِ پاک سے یہ دعا نکلتی ہے کہ:

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ — اے ہمارے پروردگار، میں نے اپنی نسل کا ایک حصّہ

غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا
لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ
النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ
لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ۔ (ابراہیم: ۳۷)

لا کر ایک بے آب وگیاہ وادی میں بسا دیا ہے، تیرے حرمت والے گھر کے پاس، اے پروردگار! اس لیے کہ وہ نماز قائم کریں۔ پس لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں سے رزق دے تاکہ یہ شکر گزار رہیں۔

اب دیکھیے کہ اس دعا کا ایک ایک لفظ کس طرح پورا کیا گیا۔ اِس بیت اللہ کے گرد یہ شہر مکہ آباد ہوا۔ حج نے اس کو تمام عرب کا مرکز بنا دیا۔ تجارتی قافلے عرب کے ہر حصے سے یہاں آنے لگے اور یہاں سے گزرنے لگے۔ اسلام سے صدیوں پہلے یہ شہر ایک تجارتی منڈی بن چکا تھا اور دنیا بھر کا مال کھچ کھچ کر یہاں آتا تھا۔ آج بھی آپ دیکھیں گے کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو مکہ کے بازاروں میں آپ کو نہ مل جاتی ہو۔ اِسی چیز کو اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں بیان فرماتا ہے کہ:

أَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا آمِنًا يُّجْبٰى
إِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا۔
(القصص: ۵۷)

کیا ہم نے اہلِ مکہ کے لیے ایک پُرامن حرم نہیں بنا دیا ہے جس کی طرف ہر طرح کے پھل کھچے چلے آتے ہیں۔ ہماری طرف سے رزق کے طور پر؟

حضرات: عرب اور عربی قوم اور عربی زبان پر یہ ساری عنایات جس مقصدِ عظیم کے لیے فرمائی گئی تھیں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایک دعا کو پورا کرنا تھا جسے قرآن مجید ان الفاظ میں نقل کرتا ہے:

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرٰهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ
الْبَيْتِ وَإِسْمٰعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ
أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ
لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ، وَ
أَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ

اور جب ابراہیم اور اسماعیل اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے تو وہ یہ دعا کر رہے تھے کہ اے ہمارے رب، ہماری اس سعی کو قبول فرمالے۔ یقیناً تو سب ہی کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب، اور ہم دونوں کو اپنا مسلم (فرمانبردار)

اَلتَّوَّابُ الرَّحِيمُ، رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ، إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (البقرہ: ۱۲۷-۱۲۹)

بنا، اور ہماری نسل سے ایک ایسی امت پیدا کر جو تیری مسلم ہو، اور ہم کو ہماری عبادت کے طریقے بتا اور ہمارے قصور معاف کر، بے شک تو ہی توبہ قبول کرنے والا رحیم ہے۔ اے ہمارے رب! اور ان لوگوں کے اندر خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیات سنائے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے یقیناً تو ہی زبردست حکیم ہے۔

یہ تھا وہ اصل مقصد جس کے لیے عرب قوم اور عربی زبان کو زندہ رکھنے کا وہ اہتمام فرمایا گیا تھا جس کی تفصیل ابھی آپ نے سنی ہے۔ حضرت ابراہیم و اسماعیل کی یہ دعا، اور اس کے نتیجے میں آخر کار اسی شہر مکہ سے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا مبعوث ہونا اور پھر یہیں سے ایک عظیم الشان امت مسلمہ کا اٹھنا جو دنیا میں قیامت تک کے لیے توحید کی علمبردار بنی، یہ اللہ جل شانہ کی نشانیوں میں سے سب سے بڑی نشانی ہے جس کا مشاہدہ آپ اس حرم پاک میں کر رہے ہیں۔

یہی شہر مکہ ہے جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت الی اللہ کا آغاز فرمایا تھا اور یہی صفا کی پہاڑی ہے جس پر کھڑے ہو کر حضورؐ نے سب سے پہلے قریش کے خاندانوں کو نام بنام پکار کر اللہ وحدہٗ لاشریک پر ایمان لانے کی تلقین فرمائی تھی۔ اس شہر کے سرداروں نے حضورؐ کی اس دعوت کو دبا دینے کے لیے اپنا سارا زور صرف کر دیا۔ یہ حرم کی زمین، یہ ابوقُبیس کا پہاڑ، اور یہ مکہ کی گھاٹیاں، سب اس ظلم وستم کے گواہ ہیں جو ۱۳ سال تک حضورؐ اور آپ کے اصحاب پر توڑا گیا تھا۔ مگر آخر کار ان سب لوگوں نے نیچا دیکھا جنہوں نے دعوت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو نیچا دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ دیکھ لیجیے، آج یہاں ابوجہل اور ابولہب کا نام لینے والا کوئی نہیں ہے اور اسی حرم کے میناروں سے پانچوں وقت اشہد ان محمداً رسول اللہ کی آواز بلند ہو رہی ہے۔

یہی خانہ کعبہ ہے جس کی دیوار کے نیچے ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور حال یہ تھا کہ مکہ میں ہر طرف مسلمانوں پر بے تحاشا ظلم ہو رہا تھا۔ اس حالت میں حضرت خباب بن الارت نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ اب تو ظلم کی حد ہو گئی ہے، کیا آپ ہمارے لیے دعا نہ فرمائیں گے؟ اس پر حضورؐ نے فرمایا: "یہ کام تو پورا ہو کر رہے گا، یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا جب ایک مسافر صنعاء سے حضر موت تک بے خوف و خطر سفر کرے گا۔ مگر تم لوگ بے صبری کر رہے ہو"۔ اللہ کے رسول کی یہ بات حرف بحرف پوری ہوئی اور چند سال کے اندر ہی وہ وقت آگیا جب اسلام کی حکومت نے پورے جزیرۃ العرب میں مکمل امن قائم کر دیا۔

یہی خانہ کعبہ ہے جس کے کلید بردار عثمان بن طلحہ سے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنجی مانگی تاکہ بیت اللہ میں داخل ہو کر عبادت کریں۔ اس نے نہ صرف یہ کہ انکار کیا بلکہ حضورؐ کے ساتھ سخت بدکلامی کی۔ آپ خاموشی کے ساتھ اس کی ساری سخت سست باتیں سنتے رہے اور پھر بڑی سنجیدگی کے ساتھ فرمایا "اے عثمان، تم دیکھو گے کہ ایک روز یہ کنجی میرے ہاتھ میں ہوگی اور مجھے اختیار ہو گا کہ جسے چاہوں دے دوں"۔ عثمان نے کہا "اگر ایسا ہوا تو وہ دن قریش کے لیے ہلاکت اور ذلت کا دن ہوگا"۔ حضورؐ نے فرمایا "نہیں، وہ قریش کے لیے عزت اور سرفرازی کا دن ہوگا"۔ یہ قول بھی پتھر کی لکیر ثابت ہوا۔ اس بات کو دس سال سے زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ مکہ معظمہ فتح ہوا۔ اسی عثمان بن طلحہ کو حضورؐ نے حکم دیا کہ کلید خانہ کعبہ پیش کرے۔ اس نے بے چون و چرا حاضر کر دی۔ حضرت عباسؓ نے باصرار درخواست کی کہ اب کلید برداری کعبہ کی خدمت بنی ہاشم کے سپرد کر دی جائے۔ لیکن حضورؐ نے وہ کنجی اسی عثمان بن طلحہ کو عطا کی اور فرمایا خذوها خالدة تالدة لا ينزعها منكم الا ظالم "اے اولاد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تم سے اس کو کوئی نہ چھینے گا مگر ظالم"۔ یہ ارشاد بھی پورا ہو کر رہا۔ آج تک اس گھر کا کلید بردار وہی خاندان چلا آ رہا ہے جسے فتح مکہ کے روز حضورؐ نے اس کی کنجی سپرد فرمائی تھی۔

یہی شہر مکہ ہے جس کے لوگوں سے حضورؐ نے اپنی دعوت کے ابتدائی زمانہ میں فرمایا تھا

کہ میں ایک ایسا کلمہ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں جسے اگر تم مان لو گے تو عرب اور عجم سب اس کی بدولت تمہارے تابع فرمان ہو جائیں گے۔ کلمۃ واحدۃ تعطونیہا، تملکون بہا العرب وتدین لکم بہا العرب۔ قریش کے لوگوں نے اس وقت اس بات کو جھوٹ سمجھا تھا۔ وہ اس کے برعکس اپنی جگہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اس کلمے کو ہم نے قبول کر لیا تو تمام عرب ہم پر ٹوٹ پڑیگا اور ہماری ریاست تو کیا، ہمارا وجود بھی یہاں باقی نہ رہ سکے گا۔ وہ کہتے تھے کہ اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا "اگر ہم تمہارے ساتھ اس ہدایت کی پیروی اختیار کر لیں تو ہم اپنی جگہ سے اچک لیے جائیں گے"۔ لیکن اللہ کے رسول کی زبانِ مبارک سے جو کچھ نکلا تھا وہ لفظ بلفظ پورا ہو کر رہا۔ قریش کے جن لوگوں نے حضور کی یہ بات اپنے کانوں سے سنی تھی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ چند سال کے اندر عرب اور عجم سب خلافتِ اسلامیہ کے تابع فرمان ہو گئے اور قریش ہی کے خلفاء اس عظیم الشان سلطنت کے فرمانروا ہوئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک یہ گھر صرف عرب کا مرکز تھا اور عرب ہی اس کے حج کے لیے آتے تھے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے یہ اعلان کرایا کہ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ "جہاں بھی تم ہو، نماز میں اپنا رُخ اسی کی طرف پھیرو"۔ اور جب مالک زمین و آسمان نے اپنے آخری نبی کے ذریعہ سے یہ فرمان صادر کیا کہ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا "اللہ کا حق ہے لوگوں پر اس گھر کا حج، جو شخص بھی اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو"، تو یہ گھر تمام دنیا کے لیے مرکز و قبلہ بن گیا۔ آج دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں اس گھر کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے والے موجود نہ ہوں، اور کوئی خطۂ زمین ایسا نہیں ہے جہاں سے اللہ وحدہٗ لاشریک کے ماننے والے اس کا حج کرنے کے لیے نہ آ رہے ہوں۔ جس وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ان احکام کا اعلان ہوا تھا اُس وقت اسلام کا نفوذ و اثر صرف مدینہ طیبہ اور اس کے گرد و پیش ایک چھوٹے سے علاقے تک محدود تھا۔ کوئی شخص بھی اُس وقت یہ اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ یہ احکام

تمام روئے زمین پر اور اتنے بڑے پیمانے پر نافذ ہونگے اور ایک وقت ایسا آئے گا جب دس دس لاکھ آدمی دنیا کے ہر حصے سے کھچ کر یہاں جمع ہونگے۔ خداوندِ عالم کی طاقت کے سوا اور کونسی طاقت ایسی ہو سکتی تھی جو اس خانۂ کعبہ کو یہ مقبولیت، یہ مرکزیت اور یہ کشش عطا کر دیتی۔

حضرات! یہ اللہ عزوجل کی بے شمار نشانیوں میں سے چند نمایاں نشانیاں ہیں جن کی طرف میں نے آپ کو توجہ دلائی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سرزمین میں آنے کی سعادت بخشی ہے تو آپ اس کا پورا فائدہ اٹھائیں اور یہاں سے گہرا، سچا، اور پختہ ایمان لے کر جائیں۔ یہاں اللہ کی جو نشانیاں نظر آتی ہیں وہ آدمی کا دل اس یقین سے بھر دینے کے لیے بالکل کافی ہیں کہ یہ گھر واقعی بیت اللہ ہے، اس کے بنانے والے حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام حقیقت میں اللہ کے رسول تھے، اور جس عظیم الشان ہستی کی بدولت یہ گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شرک و بت پرستی سے پاک ہو کر تمام دنیا کے اہلِ توحید کا قبلہ اور مرکز و مرجع بنا اس کی نبوت و رسالت ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے، صلی اللہ علیہ وسلم۔

---

# ادارۂ معارفِ اسلامی

پروفیسر خورشید احمد صاحب

دنیائے اسلام کے اہلِ فکر میں اس وقت یہ عام احساس پایا جاتا ہے کہ ہم اپنی تاریخ کے شدید ترین دورِ اضطراب سے دوچار ہیں۔ ایک طرف نئے نئے مسلمان ملک آزادی سے ہمکنار ہو رہے ہیں اور آزادی اپنے جلو میں تعمیرِ نَو کے مسائل کا ایک ہجوم لیے ہوئے آرہی ہے۔ دوسری طرف مغرب کا ذہنی، فکری اور ثقافتی غلبہ اپنی انتہا کو پہنچا جارہا ہے۔ نوجوانوں کے ذہن شک و تردّد کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ مغربیت زدہ تعلیم نئی نسلوں کو ہماری ملی روایات اور تہذیبی ورثہ سے کاٹ کر ہمارے معاشرے کی بیخ کنی کر رہی ہے۔ جدید فلسفہ اور سائنس کے حملوں نے ذہنی اطمینان اور قلبی سکون کو پامال کر دیا ہے اور قوم کے ذہین و فعال طبقے عقیدہ و عمل، دونوں کے اعتبار سے نیم مسلمان، بلکہ بعض حالات میں نامسلمان بنتے جارہے ہیں۔ آج ہماری حالت اس جہاز کی سی ہے جس کے سامنے ایک عظیم سفر کے امکانات ہوں لیکن جس کے لنگر ٹوٹ چکے ہوں۔ آج ہم اس قافلہ کی طرح ہیں جس کے پاس جوان ہمتیں تو ہوں، مگر جو منزل کا پتہ بھول گیا ہو۔ تاریخ نے ہمیں اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں ۵۲ کروڑ مسلمانوں کی یہ عظیم جمعیت اپنی ۴۳ آزاد مملکتوں کے ذریعہ ایک بے مثال عالمی کردار ادا کرسکتی ہے، لیکن اپنی اندرونی کمزوری، ذہنی غلامی اور فکری انتشار کی وجہ سے وقت کے اس چیلنج کا مردانہ وار جواب دینے کے بجائے محض گھبراہٹ اور سراسیمگی کا شکار ہے۔ تاریخ نے آج مسلمانوں کو اس عظیم آزمائش میں ڈال دیا ہے کہ ہم دَورِ جدید کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھ سکتے ہیں یا نہیں۔ صحیح حکمتِ عملی اور دانشمندانہ جدوجہد کے ذریعہ ہم تاریخ کا رُخ بدل سکتے ہیں اور ایک نئے دَور کے بانی بن سکتے ہیں۔ لیکن اگر فکر و دانش کی کمزوری اور تدبیر کی غلطی کے

باعث سیلابِ مخالف میں ہمارے قدم اکھڑ جائیں تو پھر ہم خس و خاشاک کی طرح بہ جائیں گے اور بعید نہیں کہ ایک مسلم ملت کی حیثیت سے ہمارا نام و نشان بھی باقی نہ رہے۔

وقت کے اس چیلنج کا مقابلہ جن محاذوں پر کیا جاتا ہے ان میں سے ایک اہم ترین محاذ علم و ادب اور فکر و فن کا میدان ہے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ انسانی زندگی میں افکار و نظریات کو حکمرانی قوت حاصل ہے۔ جس طرح انسان کے جسم میں دماغ کی حیثیت حکمران کی ہے اور تمام اعضاء و جوارح اس کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں، اسی طرح ایک نظامِ تہذیب میں افکار و نظریات اور عقائد و خیالات رہنما قوت ہوتے ہیں اور تمام معاشی، سیاسی اور عمرانی امور اسی کے زیرِ اثر طے ہوتے ہیں۔ وہی زمانے کا مزاج بناتی ہے، وہی خیر و شر کے پیمانے مقرر کرتی ہے، وہی اقدار اور معیارات دیتی ہے، اسی سے سوچنے کے انداز، غور و فکر کے زاویے اور عمل کے ضابطے مقرر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنی اصلاحی دعوت کا آغاز ایمان سے کرتا ہے اور پوری زندگی کی اصلاح کو ایمان کی اصلاح سے وابستہ کرتا ہے۔ آج جس بنا پر صورتِ حال سب سے زیادہ تشویشناک ہو گئی ہے وہ یہ ہے کہ بگاڑ صرف ماحول ہی میں نہیں ہے بلکہ ایمان مضمحل ہو رہا ہے۔ مغرب کے فکری استیلاء کا سب سے بڑا نشانہ ایمان اور عقائد ہی ہیں۔

پچھلی چند صدیوں سے مغربی فکر و فلسفہ کے ذریعے مسلمانوں کے ایمان پر تیشہ چلایا جا رہا ہے، ان کے افکار و نظریات کو ہدف بنایا گیا ہے، ان کے دل و دماغ کو مسموم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اور اب یہ کوششیں اپنے نتائج بھی ہمارے سامنے لا رہی ہیں۔ یہ حملہ فلسفہ اور سائنس کے ہتھیاروں سے بھی کیا جا رہا ہے اور تعلیم و تربیت کے اسلحہ سے بھی۔ اس جنگ میں پروپیگنڈا، نشر و اشاعت اور اثر و نفوذ کے تمام ذرائع کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ اخبارات و رسائل، پریس اور ریڈیو، اور تقریر و تحریر کا ہر حربہ اس مقصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے اور اس کا توڑ کرنے کے لیے گو محدود کوششیں تو ہوتی رہی ہیں لیکن منظم اور ہمہ گیر جد و جہد کا فقدان ہے۔ ضرورت ہے کہ

۱۔ اسلام کے فلسفۂ زندگی اور اس کے نظامِ حیات کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے اور اس کی

تعلیمات کو عقلی دلائل کے ساتھ آج کی زبان میں پیش کیا جائے، تاکہ اسلام کی شاہراہِ مستقیم بالکل واضح اور نمایاں ہو کر سامنے آجائے اور مختلف ذہنی سطح کے لوگ اس کو اچھی طرح سمجھ بھی لیں اور اس پر ان کے دل بھی مطمئن ہو جائیں۔ ہماری مشکلات کا ایک بڑا سرچشمہ جہل اور لاعلمی ہے۔ اسلام کا علمی سرمایہ جن زبانوں میں ہے ان تک ہماری نئی نسلوں کی رسائی نہیں اور جن اصطلاحات میں ہے اس سے آج کے لوگ نامانوس ہو گئے ہیں۔ اگر اسلام کی حقیقی تعلیمات کو آج کی زبان میں مختلف علمی سطحوں پر لوگوں کے سامنے پیش کر دیا جائے تو دین سے انحراف اور مغرب کی غلامی کا ایک بڑا سبب دُور ہو جائے گا اور اسلامی نشاۃ ثانیہ کی بنیادیں مستحکم ہو جائیں گی۔

۲۔ مغربی علوم و فنون اور نظامِ تہذیب و تمدن کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ علمِ جدید کے پورے سرمایہ کا کھلی آنکھوں اور ناقدانہ ذہن کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور بتایا جائے کہ اس میں کیا کچھ غلط اور قابلِ ترک ہے اور کیا کچھ صحیح اور قابلِ اخذ۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ خود مغرب کی ذہنی ترقی مسلمانوں کے اثرات کی پیدا کردہ ہے لیکن ایک غلط نظامِ تہذیب اور خالص مادّہ پرستانہ زاویۂ نظر نے علوم و فنون کی ترقی کو بالکل غلط رُخ دے دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ فکر و فلسفہ کا عمومی مزاج زہر آلود ہو گیا ہے اور وہ اپنی صحیح نہج پر ترقی نہیں کر رہا ہے۔ آج کی بہت بڑی ضرورت یہ ہے کہ غلامانہ ذہنیت کو ترک کر کے مغربی افکار کا مطالعہ کیا جائے، اس کی غلطیوں کو صاف الفاظ میں بیان کیا جائے اور جو کچھ اس میں صحیح ہے اس سے فائدہ اٹھانے کی ہمت کی جائے۔ تمام علوم کو اسلام کی دی ہوئی اقدار پر مرتب اور مدوّن کیا جائے اور صحیح سمت میں ان کو ترقی دی جائے۔ اسلام کا نقطۂ نظر بڑا وسیع ہے، وہ تمام علوم و فنون کی ترقی چاہتا ہے اور اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ یہ ترقی صحیح بنیادوں پر اور صحیح سمت میں ہو۔

۳۔ آج کی دنیا میں جو مسائل پیدا ہوتے ہیں، خصوصیت سے معیشت، معاشرت، سیاست اور قانون کے میدانوں میں جو نئی پیچیدگیاں رونما ہوتی ہیں ان کا مطالعہ بیدار ذہن کے ساتھ اور بالغ نظری کے ساتھ کیا جائے اور پوری وضاحت کے ساتھ بتایا جائے کہ اسلام کے اصولوں کو زمانہ حال

کے مسائل و معاملات پر منطبق کر کے ایک صالح اور ترقی پذیر تمدن کی تعمیر کس طرح ہو سکتی ہے اور اس میں ایک ایک شعبۂ زندگی کا عملی نقشہ کیا ہو گا - اسلامی اصولوں کی روشنی میں آج کا سیاسی نظام کیا ہو گا، معیشت کا ڈھانچہ کیسے بنے گا، سُود کیونکر ختم کیا جا سکے گا۔ اخلاقی اور معاشی ترقی میں مطابقت کس طرح پیدا کی جائے گی، قانونِ تجارت، قانونِ فوجداری، قانونِ شہادت وغیرہ کی تشکیل کیا بنے گی، بین الاقوامی سیاست کے ضابطے کیا ہوں گے، معاشرتی زندگی کی گتھیوں کو کس طرح سلجھایا جاتے گا ـــــ غرض جو عملی مسائل آج مسلم معاشرہ کو درپیش ہیں انہیں اسلام کی رہنمائی میں کس طرح حل کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح خیالات کو بدلنے کے ساتھ ساتھ زندگیوں کے رُخ کو تبدیل کیا جا سکے گا اور وہ تہذیبی نظام قائم ہو سکے گا جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے۔

یہ کام آج وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ خدا ان نیک بندوں اور اجتماعی تحریکوں پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے جنہوں نے اس کام کو انجام دینے کی کوشش کی ہے اور ذہنی غلامی کے اس سیلاب کے آگے بند باندھے ہیں۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کام کو منظم طریقے پر اور ایک وسیع پیمانے پر انجام دیا جاتے، ایسے ادارے قائم کیے جائیں جو اپنی ساری قوتوں اور توانائیوں کو اس علمی اور فکری جہاد کے لیے صرف کر دیں، اعلیٰ صلاحیت والے نوجوانوں کی ایک کھیپ اُٹھے جو اپنی زندگیوں کو اس عظیم کام کے لیے وقف کر دے، دوسری تمام چیزوں سے اپنی نگاہیں ہٹا کر صرف اسلام کی خدمت کو اپنا مشغلۂ حیات (CAREER) بنائے اور اس کے لیے اپنی زندگیوں کو تج دے۔

ادارۂ معارفِ اسلامی (ISLAMIC RESEARCH ACADEMY) کا قیام وقت کی اسی ضرورت کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک آزاد اور خالص علمی ادارہ ہے جسے تحقیقی اور تعلیمی مقاصد کے لیے قائم کیا جا رہا ہے۔ یہ ادارہ علم و فکر کے میدان میں اسلام کے دفاع اور اس کی ترجمانی کی کوشش کرے گا۔ اس ادارے کے ذریعہ ان تینوں خدمات کو انجام دینے کی جدوجہد کی جائے گی جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس ادارہ کا پروگرام یہ ہے:

• اسلام پر علمی و تحقیقی کام کرنا اور اس کے نظامِ فکر و عمل کے تمام پہلوؤں کو واضح طور پر پیش کرنا۔

• مختلف ذہنی معیارات کو سامنے رکھ کر دنیا کی مختلف زبانوں میں بخصوصیت سے اردو، بنگلہ انگریزی، عربی اور ایشیائی اور افریقی زبانوں میں اسلامی لٹریچر تیار کرنا اور بلند پایہ کتب کے ترجمے کرانا۔

• دورِ جدید کے پیدا کردہ مسائل پر خصوصی تنقید کرنا اور اس سلسلہ میں فی الحال خاص طور پر اسلامی قانون اور اسلامی معاشیات کے مسائل پر علمی کام کرنا۔

• مسلمانوں کی نئی تعلیمی ضروریات کو متعین کرنا اور ان کو پورا کرنے کے لیے نصابی اور امدادی لٹریچر تیار کرنا۔

• مذاکروں، مباحثوں اور مطالعہ کے حلقوں وغیرہ کے ذریعہ اسلامی افکار و مسائل پر غور و بحث کی صحت مندانہ روایات قائم کرنا اور اسلام کے حق میں فضا تیار کرنے کی کوشش کرنا۔

• نوجوانوں کی ذہنی اور علمی تربیت کے لیے مناسب انتظامات کرنا۔

یہ ہیں وہ کام جو اس وقت ادارہ کے پیشِ نظر ہیں۔ جن حضرات کی زیرِ نگرانی یہ ادارہ کام کر رہا ہے وہ یہ ہیں:

| | |
|---|---|
| ۱۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی : لاہور | صدر |
| ۲۔ مولانا محمد ناظم ندوی، پرنسپل جامعہ عباسیہ بہاولپور | نائب صدر |
| ۳۔ مولانا عبدالرحیم صاحب ، ڈھاکہ | نائب صدر |
| ۴۔ خورشید احمد۔ ایڈیٹر وائس آف اسلام و چراغِ راہ ، کراچی | معتمد اعلیٰ |
| ۵۔ چودھری غلام محمد ، کراچی | خازن |
| ۶۔ مولانا منتخب الحق صاحب صدر شعبہ معارف اسلامیہ کراچی یونیورسٹی ، کراچی | رکن مجلس انتظامیہ |
| ۷۔ مولانا ظفر احمد انصاری کراچی | رکن مجلس انتظامیہ |
| ۸۔ میاں طفیل محمد ، لاہور | رکن مجلس انتظامیہ |

یہ ادارہ کراچی، لاہور اور ڈھاکہ میں کام شروع کر رہا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ تمام اسلام پسند حضرات ادارہ سے پورا پورا تعاون کریں گے اور ہر ممکن علمی، اخلاقی اور مالی مدد سے اس فکری جہاد میں ہمارے ہاتھ مضبوط کریں گے۔ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔

---

# رسائل و مسائل

## جوازِ سود کے حق میں ایک روایت سے غلط استدلال

سوال: پراویڈنٹ فنڈ جو گورنمنٹ کاٹتی ہے اس پر فنڈ جمع کرانے والے کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے سود لے، چاہے نہ لے۔ اسی طرح سیونگ سرٹیفکیٹ کا معاملہ ہے۔ مجھے ایک عالم نے فرمایا ہے کہ حکومت اپنی جانب سے کچھ دینا چاہے، خواہ وہ سود کے نام سے ہو یا نہ ہو، اور اس کی مقدار مقرر ہو یا نہ ہو، اس کا لے لینا جائز ہے اور وہ سود نہیں ہے۔ انہوں نے ایک حدیث بیان فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غزوے کے وقت ایک اونٹ کے بدلے دو اونٹ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس سے یہ اجتہاد کیا جا سکتا ہے کہ گورنمنٹ اگر چاہے تو بوقت ضرورت اپنی طرف سے کچھ زائد رقم لوٹانے کے وعدے پر لوگوں سے روپیہ لے سکتی ہے۔ اسی طرح جو زائد روپیہ دیا جاتا ہے، وہ جائز ہے۔ حوالہ طلب کرنے پر انہوں نے بلوغ المرام، کتاب البیوع، باب الربٰو کی ایک حدیث کی نشان دہی کی ہے جو درج ذیل ہے:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص بیان کرتے ہیں ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم امرہ ان یجھز جیشا فنفدت الابل فامرہ ان یاخذ علی قلائص الصدقۃ قال فکنت اٰخذ البعیر بالبعیرین (رواہ الحاکم والبیہقی ورجالہ ثقات)۔

براہ کرم آپ اس حدیث پر، نیز اس سے عالم موصوف کے استنباط پر روشنی ڈالیں اور بتائیں کہ بیان کردہ مسئلہ درست ہے یا نہیں۔

جواب:- آپ کی نقل کردہ حدیث سے اگر کسی عالم صاحب نے وہی استدلال فرمایا ہے جو آپ کے سوال میں مذکور ہے تو اس سے اتفاق ممکن نہیں ہے۔ یہ استدلال چند در چند خامیوں اور غلط فہمیوں پر مشتمل ہے۔ حدیث کا اگر محتاط لفظی ترجمہ کیا جائے تو یوں ہو گا: حضرت عمروؓ بن عاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک لڑائی کا ساز و سامان تیار کرنے کا حکم دیا پھر اونٹ ختم ہو گئے تو آنحضورؐ نے حکم دیا کہ زکوٰۃ کی اونٹنیوں کے عوض میں اونٹ حاصل کیے جائیں پس میں دو دو اونٹوں کے بدلے میں ایک اونٹ لیتا تھا، تا آنکہ زکوٰۃ کے اونٹ آ جائیں"۔

امر اول جو قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آنحضورؐ نے خود یہ شرط مقرر یا تسلیم فرمائی تھی کہ ایک اونٹ کے عوض میں دو ملیں گے۔ یہ حضرت عمروؓ کا اپنا قول ہے جس کے بارے میں صراحت موجود نہیں کہ آنحضورؐ کو اس کا علم تھا یا نہیں، اور آپ نے اسے برقرار رکھا یا نہیں، بلکہ خود حضرت عمروؓ کے بارے میں بھی یہ واضح نہیں کہ انہوں نے زکوٰۃ کے اونٹ فراہم ہو جانے کے بعد ایک اونٹ کے عوض میں دو اونٹ دیئے یا نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ روایت کے الفاظ سے صاف طور پر یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ بیع کا معاملہ تھا یا قرض کا، چنانچہ شارحین میں سے بعض نے اسے بیع کے مفہوم میں لیا ہے اور بعض نے قرض کے مفہوم میں، یعنی بعض کے نزدیک جانور خرید لیے گئے تھے اور ان کی قیمت کے عوض میں دوسرے جانور دیئے جانے تھے اور بعض کے نزدیک جانور قرض لیے گئے تھے۔

بلاشبہ صاحب بلوغ المرام نے اس حدیث کو بیہقی اور حاکم کے حوالے سے نقل کر کے فرمایا ہے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں لیکن امام بیہقی و حاکم کی یہ روایت اس پائے کی نہیں ہے کہ مجرد ایک مجمل توثیق کے بل پر اسے بلا تردد قبول کر لیا جائے، بالخصوص جبکہ اس کے متن میں ابہام و اشکال ہو اور اس کا مضمون احادیث صحیحہ و کثیرہ سے متعارض ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اپنی شرح مسک الختام میں اس روایت کے ضعف پر دلالت کرنے والے اقوال بھی نقل کیے ہیں اور اپنی رائے ان الفاظ میں دی ہے: گویم وجہ ضعف حدیث ابن عمرو آنست کہ در سندش

محمد ابن اسحاق است و در وے مقال است (میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کے کمزور ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا ایک راوی محمد ابن اسحاق ہے، جس میں کلام کیا گیا ہے)۔

پھر اس حدیث کے الفاظ سے یا اس کے شارحین کے اقوال سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس میں کس غزوے کا ذکر کیا گیا ہے۔ سُود اور اس کے متعلقات کے متعلق قطعی اور تفصیلی احکام عہدِ نبوی کے اواخر میں دیئے گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ اس سے پہلے کا ہو۔ اگر ایسا ہو تو ظاہر ہے کہ معاملے کی یہ صورت منسوخ قرار پائے گی۔

اس بارے میں آخری مگر خاص طور پر لائقِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ حدیث حیوانات کے مبادلے اور لین دین سے متعلق ہے، جن کا معاملہ نقود و اجناس سے بالکل الگ اور مختلف ہے۔ حیوانات کی چونکہ کوئی متعین بازاری قیمت یا شرح نہیں ہے، انہیں ناپا اور تولا نہیں جاسکتا اور اپنی عمر، نسل، صلاحیت اور افادیت کے اعتبار سے ایک ہی نوع کے ایک جانور اور دوسرے جانور میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے، اس لیے خاص حیوانات کے معاملے میں شریعت کے احکام زیادہ سخت اور قطعی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس بارے میں فقہاء و محدثین کی آراء بھی مختلف ہیں کہ جب حیوانات کا دست بدست یا ادھار پر تبادلہ کیا جائے، یا جانور قرض دے کر جانور ہی قرض میں واپس لیا جائے تو آیا اس صورت میں تفاضل (یعنی کمی بیشی) جائز ہے یا نہیں؟ بعض کے نزدیک جانوروں کی تعداد اور عمر وغیرہ میں تفاضل کے باوجود اگر معاملہ بیع کا ہو اور دست بدست ہو تو جائز ہے، لیکن جانوروں کے بدلے میں جانوروں کا قرض پر لین دین جائز نہیں۔ اس مسلک کے حق میں ایک حدیث بلوغ المرام کے اسی باب میں موجود ہے کہ: عن سَمُرَةَ بن جُنْدُبٍ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن بیع الحیوان بالحیوان نسیئۃً۔ (حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے کہ جانور کے بدلے جانور ادھار بیچا جاتے)۔ اس مسلک کے قائلین کے نزدیک حضرت عمرو بن عاص والی روایت قابلِ حجت و استناد نہیں ہو سکتی کیونکہ جانور بیچ کر اگر اس کے بدلے میں جانور کا ادھار کرنا ممنوع ہے تو جانور قرض دے کر بعد میں جانور وصول کرنا کیسے جائز ہو گا؟ بعض فقہاء ایسے بھی ہیں

جو جانوروں کے مبادلے کو سرے سے صحیح ہی نہیں سمجھتے خواہ بیع کا معاملہ ہو یا قرض کا، اور بیع کی صورت میں ثمن ہاتھوں ہاتھ ملے یا ادھار رہے۔

لیکن آپ کو بھی اور رحمٰن عالم صاحب نے پراویڈنٹ فنڈ، سیونگ سرٹیفکیٹ دیا دیگر رقوم قرض، پر سُود کو محض اس ایک ضعیف و مرجوح روایت کے بل پر حلال کرنے کی سعی فرمائی ہے، انہیں بھی یہ بات پھر ایک مرتبہ اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ تفاضُل کے جواز و عدم جواز کے جس اختلاف کا ذکر ابھی اُوپر ہوا ہے، یہ نقدی یا سونے چاندی سے بہرحال متعلق نہیں ہے اس کا تعلق محض حیوانات یا کچھ دوسری اشیاء سے ہے۔ چودہ سو سال میں علمائے اُمّت کا سلف سے خلف تک کامل اتفاق ہے کہ درہم و دینار اور روپے پیسے کے نقد یا قرض لین دین میں اضافہ و تفاضل کی پیشگی شرط قطعی سُود ہے اور حرام ہے۔ اس متفق علیہ مسلک کی بنیاد کتاب و سنّت کے نہایت صریح اور محکم نصوص پر قائم ہے۔ کوئی شخص کمزور ہتھیاروں کے ساتھ اس بنیاد کو ہرگز منہدم یا متزلزل نہیں کر سکتا۔

(ع - غ)

---

# افتراقِ امّت اور فرقۂ ناجیہ

سوال: میں اس حدیث کے سلسلے میں رہنمائی کا طالب ہوں جو تہتر فرقوں سے متعلق ہے اور جس میں مذکور ہے کہ ایک فرقہ ناجی اور باقی دوزخی ہوں گے۔ کیا یہ حدیث صحیح و قوی ہے یا ضعیف و موضوع ہے۔

اگر یہ حدیث صحیح ہے تو نجات پانے والا فرقہ کونسا ہے اور کیا اس کے ماسوا سارے فرقے کچھ نہ کچھ عرصہ کے لیے دوزخ میں ڈالے جائیں گے؟ بظاہر یہ بات بڑی پریشان کُن اور خوفناک ہے کہ اس امت کی اکثریت آگ کے عذاب سے محفوظ نہ رہے اور دوزخ کی مستحق قرار پائے۔

جواب: افتراقِ امت سے متعلق جس حدیث کے بارے میں آپ نے دریافت کیا ہے

وہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں تو موجود نہیں ہے، البتہ سنن ابی داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں آئی ہے
ابو داؤد (کتاب السنۃ) کی ایک روایت میں اس کے الفاظ یہ ہیں:

افترقت الیہود علی احدی او ثنتین و سبعین فرقۃ و تفرقت النصاری علی احدی او ثنتین و سبعین فرقۃ و تفترق امتی علی ثلاث و سبعین فرقۃ۔

دوسری روایت میں اتنا زائد ہے: ثنتان و سبعون فی النار و واحدۃ فی الجنۃ وھی الجماعۃ
ان کا ترجمہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کے ۷۱ یا ۷۲ فرقے بنے اور میری امت کے ۷۳ فرقے ہو نگے جن میں سے ۷۲ آگ میں ہونگے اور ایک جنت میں اور جنتی گروہ وہ ہے جو "الجماعۃ" ہے۔

ترمذی کی روایت میں الجماعۃ کے بجائے "ما انا علیہ و اصحابی" کے الفاظ ہیں، یعنی وہ ملت جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں۔"

امام ترمذی نے اس حدیث کو "حسن غریب" قرار دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ صحیح کے مرتبے کو نہیں پہنچتی۔ اس کا راوی منفرد ہے تاہم دیگر شرائط کے لحاظ سے یہ حسن یعنی حسنِ ظن اور اعتماد کی مستحق ہے۔ محدثین کا کسی حدیث کو صحیح قرار نہ دینا ایک خاص فنی یا اصطلاحی مفہوم رکھتا ہے۔ اس کا مطلب فقط یہ ہوتا ہے کہ اس کی سند صحت کے اعلیٰ ترین معیار پر پوری نہیں اترتی، لیکن اس سے اس حدیث کا ضعیف یا موضوع ہونا لازم نہیں آتا۔

جہاں تک اس حدیث کے متن کے پہلے حصے کا تعلق ہے اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ قرآن، حدیث اور لغتِ عرب میں کئی مثالیں ایسی موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ عربی میں ستر یا کچھ اوپر ستر کا عدد دراصل کثرتِ تعداد کے لیے ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس سے متعین طریق پر کوئی گنتی مراد نہیں ہوتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا مدعا یہ تھا کہ یہود و نصاریٰ میں بھی کچھ کم گروہ پیدا نہیں ہوئے لیکن تم ان سے بھی بازی لے جاؤ گے اور ظاہر ہے کہ جو امت آخری ہے اور قیامت تک قائم اور باقی رہنے والی ہے اس میں اگر پہلی امتوں سے زائد فرقے پیدا ہوں تو یہ کوئی ناممکن یا عجیب بات نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اتنے کثیر فرقوں کا وجود ہر زمانے میں ہوگا، بلکہ مراد

یہ ہے کہ فرقے بکثرت بنتے اور ٹوٹتے رہیں گے۔

حدیث کے دوسرے حصّہ کے بارے میں البتہ دو سوال پیدا ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کونسا فرقہ ہے جسے جنت کی بشارت دی گئی ہے؟ دوسرا یہ کہ امتِ محمدیہ کا باقی حصّہ اور بظاہر بہت بڑا حصّہ اس بشارت کا مستحق کیوں نہ ہوگا؟ ان سوالات کا جواب یہ ہے کہ جس فرقے کو حدیث میں جنتی قرار دیا گیا ہے اس کا اطلاق ان فرقوں میں سے کسی ایک فرقے کے ہر کس و ناکس پر کرنا صحیح نہیں ہے جو مخصوص اور معروف ناموں کے ساتھ اس زمانے میں موجود ہیں یا پہلے کسی زمانے میں موجود تھے۔ ان میں سے کوئی بھی فرقہ اپنی امتیازی شان کے ساتھ عہدِ رسالت میں موجود نہ تھا کیونکہ اُس دَورِ سعادت میں وہ سیاسی، اجتہادی اور کلامی اختلافات رونما ہی نہ ہوئے تھے جو بعد میں فرقوں کی تخلیق کا موجب بنے۔ اس لیے صحابہ کرام بلکہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے بارے میں بھی یہ کہنا بالکل بے محل معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان فرقوں یا گروہوں میں سے کسی خاص گروہ میں شامل تھے۔

میرا ناقص گمان یہ ہے (واللہ اعلم بالصواب) کہ جس جنتی گروہ کی نشان دہی فرمانِ نبوی میں کی گئی ہے اس میں امتِ محمدیہ کے ہر طبقے کے افراد شامل ہوں گے اور اس کی تشکیل و ترتیب قیامت کے روز ہوگی۔ اُس جنتی گروہ کی متعین صفات حدیث میں بیان کر دی گئی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ اس گروہ کے افراد اُس راستے پر مضبوطی سے گامزن رہیں گے جو نبیؐ اور اس کے اصحاب کا راستہ ہے (ما انا علیہ واصحابی)، اور جو اس نظامِ جماعت سے وابستہ رہیں گے یا اس کے قیام و بقا کے لیے کوشاں رہیں گے جسے الجماعہ کا نام دیا گیا ہے اور قیامت تک جس کے غلبہ و وجود کی بشارت دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے علم و عدل کی بنا پر حشر کے روز اس پوری امّت میں سے چھانٹ چھانٹ کر اس جنتی گروہ کو مرتب فرمائے گا۔ اسی گروہ میں اللہ کا نبیؐ، اُس کے صحابہ اور اس امّت کے سارے مخلصین مُصلحین اور صالحین ہوں گے، خواہ وہ دنیا میں حنفی یا شافعی یا مقلد یا غیر مقلد کہلاتے رہے ہوں یا وہ مسلمانوں کے متعارف فرقوں میں سے کسی فرقے کی جانب منسوب نہ کیے گئے ہوں۔

ہر مومن کی دُعا یہ ہونی چاہیے کہ اسے اللہ اس گروہ میں شمولیت کا شرف عطا فرماتے اور محمدؐ اور اس کے اصحاب و اتباع کی معیت نصیب فرماتے۔

یہ خیال کرنا بھی صحیح نہیں ہے کہ اگر ایک گروہ جنتی ہو اور ۷۱ یا ۷۲ گروہ دوزخی ہوں تو گویا اکثریت دوزخی ہوتی۔ فرض کیجیے کہ مسلمانوں کا سواد اعظم حق پر ہو اور بے شمار چھوٹے چھوٹے فرقے گمراہیوں کی بنیاد پر بنتے بگڑتے رہیں تو ان فرقوں کے افراد کی مجموعی تعداد سواد اعظم کے افراد کی تعداد سے بہت کم رہے گی۔ اس لیے محض فرقوں کے اعداد کو سامنے رکھ کر اکثریت و اقلیت کا فیصلہ کرنا بڑا ہی غلط ہے۔ کروڑوں آدمیوں کی صحیح المسلک جماعت اگر ایک طرف ہو اور بہت سی گمراہ ٹکڑیاں دوسری طرف ہوں جن کی مجموعی تعداد چند لاکھ سے متجاوز نہ ہو، تو ظاہر ہے کہ نجات پانے والے اکثریت میں ہوں گے، نہ کہ اقلیت میں۔

---

## ضروری گذارش

ترجمان القرآن کے خریدار حضرات سے ضروری التماس ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں جو ان کے پتہ کی چٹ پر درج ہوتا ہے۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت کا دفتر ذمہ دار نہ ہوگا۔

مینجر ترجمان القرآن لاہور

---

## (بقیہ اشارات)

مزاحم نہ ہونگے چنانچہ شیطان کے انہی ہتھکنڈوں کا نتیجہ ہے کہ برائی ہر جگہ کھلے بندوں دندناتی پھر رہی ہے اور شرافت ہر مقام پر دبک کر رہ گئی ہے، شر منظم ہو کر ایک سیلِ بے پناہ کی طرح ہر طرف امنڈتا جا رہا ہے اور نیکی خس و خاشاک کی طرح اُس کے آگے بہنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے۔ اس کے اندر آج بدقسمتی سے کوئی طاقت اور توانائی باقی نہیں رہی اور وہ کسی مرحلہ پر بھی شر سے نبرد آزما ہونے کی ہمت نہیں کر سکتی۔

---

نیکی کی یہ بے بسی دیکھ کر انسان کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کے حاملین اب دنیا سے بالکل مٹ چکے ہیں اور انسانیت نے پورے شعور کے ساتھ شیطان کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے؟ اس سوال کے جواب کے لیے جب ہم حالات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نیکی دنیا سے ناپید نہیں ہوئی۔ آج بھی انسانوں کی عظیم اکثریت اگر اس کی علمبردار نہیں تو دل و جان سے اس کی قدرداں ضرور ہے۔ وہ اس بات کی آرزومند ہے کہ دنیا میں خیر اور بھلائی کو فروغ حاصل ہو اور فسق و فجور یہاں سے مٹے۔ پھر نیک لوگوں کی تعداد بھی کوئی اتنی کم نہیں کہ ان کا سرے سے کوئی وزن ہی نہ ہو۔ آج بھی معاشرے کے اندر ایسے لوگ کافی تعداد میں موجود ہیں جن کی پرہیزگاری، خدا خوفی، نیک نفسی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ حضرات کافی تعداد میں موجود ہونے کے باوجود بالکل بے اثر ہیں۔ اس کی وجہ ہمارے نزدیک ایک ہی ہے کہ نیکی منظم نہیں، اور شر اس کے مقابلہ میں منظم و متحد ہے۔

وہ لوگ جو انسانی نفسیات سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسانوں کی عظیم اکثریت بالکل انفعالی مزاج رکھتی ہے۔ اگر خیر اور بھلائی منظم ہو کر ایک قوت بن جاتے تو عام لوگ اسی کی پیروی کرنے لگتے ہیں اور اس کے برعکس اگر برائی اپنی قوتوں کو سمیٹ کر ایک تحریک کی صورت میں ڈھل جاتی تو پھر وہ معاشرے پر اپنے اثرات مترتب کرنا شروع کر دیتی ہے۔

---

ہم یہ بات کسی فخر و مباہات کی بنا پر نہیں بلکہ محض تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ اُس نے اسلامی معاشرے میں خیر اور بھلائی کی قوتوں کو امکانی حد تک ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے عقائد اہلِ سنت کے عقائد سے کسی لحاظ سے بھی مختلف نہیں۔ یہ کسی نئی امت یا کسی نئے فرقے کی تشکیل کی دعوت نہیں دیتی۔ یہ کسی ایسے زعم میں بھی اپنے آپ کو گرفتار نہیں پاتی جس کے تحت یہ کہا جا سکے کہ نیکی اور پرہیزگاری بس اس کے اندر ہی سمٹ کر رہ گئی ہے اور اس کے باہر جو کچھ بھی ہے وہ فسق و فجور ہی ہے۔ بعض مفاد پرست لوگ ہیں۔ بارہا اسلام اور صالحیت کے ٹھیکیدار ہونے کا طعنہ دیتے ہیں لیکن وہ علیم و خبیر ذات جس سے دل کی کوئی کیفیت بھی پوشیدہ نہیں وہی اس الزام کی حقیقت کو اچھی طرح جانتی ہے۔ خدا نہ کرے کہ ہم کبھی اس زعمِ باطل میں گرفتار ہوں ہم نے اپنی طرف سے اس امر کی صراحت کرنے کی پوری کوشش کی ہے کہ جو مسلمان جماعت میں شامل نہیں، وہ بھی اسی طرح کے مومن و مسلم ہیں جس طرح کہ جماعت سے تعلق رکھنے والے لوگ، اور ہمیں تسلیم ہے کہ جماعت سے باہر کے بہت سے حضرات تقویٰ، پرہیزگاری، للہیت کے اعتبار سے اس اونچے مقام پر فائز ہیں جس پر جماعت کے رفقاء کو بھی رشک آتا ہے۔ ہماری جو کچھ کوشش بھی ہے اس کا ہدفِ مقصود صرف ایک ہی ہے کہ کسی طرح نیکی اور پاکبازی کے ان اعلیٰ مگر منتشر نمونوں کو ایک سلک میں منسلک کر دیا جائے تاکہ خیر اور بھلائی ایک قوت بن کر برائی کا مقابلہ کر سکے۔

---

نیکی کی تخم ریزی بلاشبہ انسانی قلب کے اندر ہی ہوتی ہے لیکن خیر کا یہ بیج اپنی صحیح نشو و نما کے لیے اس بات کا محتاج ہے کہ اسے ایک صحت مند ماحول میسر آئے۔ اسی صحت مند ماحول کے پیدا کرنے کے لیے جماعتِ اسلامی اول روز سے کوشاں ہے۔ ہم قرآن و سنت اور آویزشِ خیر و شر کی پوری تاریخ کے مطالعہ سے اسی ایک نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ دین کی اصل

بنیاد خدا اور بندے کے درمیان صحیح تعلق ہے لیکن اس تعلق کو تقویت پہنچانے اور اس کی صحیح نہج پر پرورش کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہم ان موانع کو دور کرنے کی کوشش کریں جو اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ خدا اور بندے کا باہمی تعلق کوئی پرائیویٹ رشتہ نہیں بلکہ یہ تعلق ہی اس بات کا متقاضی ہے کہ انسان کا انسان کے ساتھ تعلق اور پھر اُس کا پوری کائنات اور دنیاوی اسباب و وسائل کے ساتھ تعلق بھی صحیح خطوط پر استوار ہو۔

انہی تعلقات کو ہم اسلامی نظام کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہم جو اس نظام کے قیام کی انسانیت کو دعوت دے رہے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ خداوند تعالیٰ کی رضا جوئی اب ہمارے نزدیک ایک ثانوی حیثیت کی چیز بن کر رہ گئی ہے اور ہماری جد و جہد کا اصل مقصد صرف ایک نظام کا برپا کرنا ہے۔ یہ ایک جھوٹ ہے جسے ہمارے خلاف گھڑا گیا ہے۔ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ دین میں اصل اہمیت تعلق باللہ کی ہی ہے لیکن یہ تعلق خارجی زندگی میں بھی منعکس ہوتا ہے اور پھر یہ تعلق انسان کے سارے تعلقات میں ایک ہمہ گیر تبدیلی کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ تعلق اس بات کا طالب ہے کہ انسان اگر اپنے رب کے حضور میں ایک خاص نظام کے تحت سجدہ ریز ہو، اس کی راہ میں جانی اور مالی ایثار کرے تو اس تعلق کی اساس پر اپنی سیاست، معیشت اور معاشرت کو بھی ازسرِنو ترتیب دے تاکہ اُس کی داخلی زندگی اور خارجی زندگی کے درمیان کوئی تضاد باقی نہ رہے اور اس کی جو قوتیں اور صلاحیتیں اس کشمکش میں صرف ہو رہی ہیں وہ باطل کو سرنگوں کرنے میں کھپائی جا سکیں۔

---

قرآن مجید میں ذکر و شکر، خشیت و تضرع، خشوع و خضوع کے جو الفاظ اللہ کے ساتھ قلبی لگاؤ اور روحانی تعلق کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں یہ بلاشبہ بندۂ مومن کی داخلی کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان داخلی کیفیات کو اپنے صحیح مرتبہ اور مقام پر برقرار رکھنے کے لیے خارجی زندگی کی موافقت بھی انتہائی ضروری ہے

ایک شخص اپنے رب کا بڑا ہی مطیع اور فرمانبردار ہے، اور اس کے خوف سے لرزنے والا ہے۔ اس کے خالق اور مالک نے روزہ اور نماز کی صورت میں جو فرائض اس پر عائد کیے ہیں انہیں بڑے شوق کے ساتھ بجا لاتا ہے مگر اس کے رزق میں حرام عناصر کی آمیزش بھی ہے جس سے وہ کسی صورت بھی بچ نہیں سکتا۔ کیا یہ عناصر اُس کے دل کے صاف اور شفاف آئینے کو مکدر نہیں کر دیں گے اور پھر اس تکدر کا اثر تعلق باللہ پر نہیں پڑے گا؟

ہمارے اس دور میں فسق و فجور کا جو خوفناک طوفان ہر طرف سے اٹھ رہا ہے اس کی تباہ کاریوں سے کون ناواقف ہے۔ اس نے اُن پاکباز اور مقدس لوگوں کے گھروں کو بھی برباد کر دیا ہے جن میں آج سے چند سال پہلے ذکرِ الٰہی کے بڑے چرچے ہوا کرتے تھے۔ قرآن اور سنت کی تعلیم دینے والوں کے صلب سے آج دشمنانِ دین پیدا ہو رہے ہیں، اور اصلاح و ارشاد کے فرض کو انجام دینے والے آج اپنی اولاد کے منہ سے الحاد اور زندقہ کا پرچار سنتے ہیں مگر کچھ کر نہیں سکتے اور خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں۔ ماحول نے انہیں اپنی آہنی گرفت میں اس قدر شدت سے لے لیا ہے کہ وہ بیچارے تمنا اور آرزو رکھنے کے باوجود کچھ کر نہیں پاتے۔ کیا اس افسوسناک صورتِ حال سے تعلق باللہ پر کوئی زد نہیں پڑتی؟

---

عابد و معبود کا رشتہ کوئی بے حس اور بے جان رشتہ نہیں جس پر زمانے کے حالات کسی طرح بھی اثر انداز نہ ہونے پائیں۔ یہ رشتہ اپنے مزاج کے اعتبار سے بڑا حساس اور غیرت مند ہے جب کوئی شخص ایک مرتبہ اپنے آپ کو اس میں منسلک کر لیتا ہے تو پھر اُسے اپنے باقی رشتوں کو بھی اسی کے تابع کرنا پڑتا ہے۔ یہ رشتہ اس بات کو کبھی گوارا ہی نہیں کرتا کہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق تو اسلام کے بتاتے ہوتے ضابطے کے مطابق قائم کیا جاتے مگر انسان اور انسان کے درمیان تعلقات اور انسان اور کائنات کے درمیان تعلقات کفر اور الحاد کی بنیادوں پر استوار ہوں۔ یہ رشتہ بڑا ہمہ گیر ہے اور ہمہ گیر تبدیلی کا مطالبہ کرتا ہے۔

---

اس مقدس رشتہ کی ہمہ گیری پر پوری انسانی تاریخ گواہ ہے۔ اگر تعلق باللہ صرف ایک داخلی کیفیت کا نام ہوتا تو مسلمانوں کے اندر تجدید و احیائے دین کی ہر دور میں جو کوششیں ہوئی ہیں اُن سب کا قریب قریب ایک ہی رُخ ہوتا لیکن ہم انہیں اصول اور مزاج کے اعتبار سے ایک جانتے ہوئے بھی اُن کے دائرۂ کار کو ایک دوسرے سے مختلف پاتے ہیں۔ ایک گروہ اٹھتا ہے اور وہ لوگوں کے دلوں کی انگیٹھیوں کو گرمانے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرا اسلامی علوم کی ترویج و اشاعت کے لیے ہمت آزما نظر آتا ہے، تیسرا جباروں اور قہاروں کے خلاف کلمۂ حق بلند کرتا ہے، چوتھا عوام کے افکار و نظریات کی تطہیر میں اپنی قوتیں کھپاتا ہے، پانچواں قرآن و سنت کے سرمدی چشموں سے فیضیاب ہو کر معاشرتی زندگی کے لیے تفصیلات مرتب کرتا ہے، چھٹا مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے جاہلیت کو مٹانے، اسے احکامِ الٰہی کے مطابق ڈھالنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگاتا ہے۔ ان مختلف کوششوں میں سے آپ کسی ایک کوشش کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی تہ میں بجز اللہ کی رضا کے کوئی دوسرا محرک کام کر رہا ہے۔ یہ ساری کوششیں تعلق باللہ کے تقاضوں کے تحت ہی کی جاتی رہی ہیں۔ اللہ کا دین ایک پورا نظامِ فکر و عمل ہے جس کی رفیع الشان عمارت اپنے خالق اور مالک کے ساتھ صحیح اور مضبوط تعلق کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہے۔ اس تعلق کو جس طرف سے بھی صدمہ پہنچنے کا احتمال ہوا مسلمانوں کے حساس اور فرض شناس طبقے اسی طرف فوراً متوجہ ہوئے۔ اگر انہوں نے یہ محسوس کیا کہ امتِ مسلمہ کی معاشرتی زندگی تو اسلامی آئین و ضوابط کے مطابق چل رہی ہے لیکن اس میں روح باقی نہیں رہی تو انہوں نے فوراً آگے بڑھ کر اس میں روح پھونکنے کی کوشش کی۔ پھر انہوں نے جب یہ دیکھا کہ جاہلیت کی یلغار ان کی معاشرتی زندگی کے لیے خطرہ بن رہی ہے تو انہوں نے پوری قوت سے اس کا راستہ روکنے کی جدوجہد کی۔ اسی طرح انہوں نے جب یہ مشاہدہ کیا کہ اُن کا سیاسی اور معاشی نظام اس بنیاد پر قائم نہیں رہا جو انہیں قرآن و سنت نے فراہم کی ہے تو انہوں نے اجتماعی زندگی کے اندر تبدیلی پیدا کرنے کا عزم کیا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا

سکتا ہے کہ انہوں نے ہر عہد میں اس بات کا اہتمام کیا کہ یہ اسلامی نظام کسی طرح اپنی اصلی شکل میں برقرار رہے اور اس کی ہمہ گیری میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ انہوں نے جس جہت سے بھی کوئی کمی دیکھی اُسے فوراً پُورا کرنے کی کوشش کی۔ اسلام کا ہمہ گیر تصوّر ہی سامنے رکھ کر ہم اپنی تاریخ کی صحیح تعبیر کر سکتے ہیں اگر یہ تصوّر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے تو پھر ہمارے بہت سے ائمہ اور صلحاء کی کوششوں کو جنہوں نے نظامِ حکومت کو بدلنے کی سعی کی بجز مفاد پرستی کے کسی چیز پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں فکر و نظر کے ان فتنوں سے بچائے جن کے تحت ہم خدا پرستوں کی مخلصانہ اور سرفروشانہ کوششوں کو دنیا پرستی سے تعبیر کرنے کی جسارت کریں۔

---

## (بقیہ مطبوعات)

موجودہ خامیوں کی نشاندہی کی ہے اور ان کا علاج تجویز فرمایا ہے۔ کتاب میں ضمناً گوناگوں مباحث آگئے ہیں۔ آخر میں انہوں نے برِصغیر کی دینی جماعتوں پر بھی ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور ان کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

یتیم پوتے کا مسئلہ مصنّف: میاں محمد نوشہروی۔ ناشر ادارہ عروجِ اسلام راوی پارک لاہور۔ قیمت ۶ آنہ۔

میاں محمد نوشہروی ایک دردمند عالم ہیں، اور اپنے علم و فہم کی حد تک تصنیف و تالیف کے ذریعہ دین کی خدمت انجام دیتے رہتے ہیں۔ زیرِ نظر پمفلٹ میں انہوں نے یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلے میں منکرینِ حدیث کے شبہات و دلائل کا جواب دیا ہے۔

---

# مطبوعات

**ہمارے عائلی مسائل** | مصنف: مولانا محمد تقی عثمانی استاذ دارالعلوم کراچی۔ ناشر دارالاشاعت مولوی مسافر خانہ کراچی ۱ قیمت: ۲ روپیہ ۷۵ پیسے۔ صفحات ۲۵۶

آزادی وطن کی تحریک میں کچھ ایسے عناصر بھی اُبھر آئے جن کا دین و مذہب سے تعلق محض رسمی تھا۔ نہ مذہبی تعلیم انہوں نے حاصل کی تھی نہ ایسی تربیت ہی انہیں میسر آئی تھی جو کم از کم ان کے اندر دین کے ساتھ جذباتی شیفتگی ہی پیدا کرتی۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کا سواد اعظم دین کے ساتھ گہری جذباتی وابستگی رکھتا تھا اس وجہ سے ان کے لیے اس وقت اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ دین کے نام پر اپیل کرتے۔ پھر جب آزادی [illegible] دین کے نام پر مسلمانوں کی ایک [illegible] مملکت معرضِ وجود میں آئی تو یہی لوگ [illegible] سربراہ کار بنے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک [illegible] طبقہ [illegible] وسائل و ذرائع کی طاقت کے بل پر پورے ملک کو اس رنگ میں رنگنے پر تُل گیا جس میں وہ خود رنگے ہوئے تھے۔ اس مقصد کی خاطر ایک طرف تو ایسے ادارے قائم کیے گئے جن کا کام ہر منکر کو معروف بنانا تھا۔ اور دوسری طرف ہر ممکن طریقے سے یہ کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کو ان کے دین کے اجتماعی پہلو سے دُور ہٹایا جاسکے۔ کیونکہ ان کی نظر میں ایک شخص کا اپنے کمرے میں نماز پڑھ لینا یا تسبیح پھیر لینا چنداں خطرناک نہ تھا۔ البتہ کمرے سے باہر کی زندگی میں دین کے تقاضوں کو پورا کرنے سے زیادہ خطرناک بھی ان کے نزدیک کوئی دوسری چیز نہ تھی۔

[illegible] نامہ بارک کے سلسلے میں مسلمانوں کے پرسنل لا کو تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی اور ایک کمیشن بنایا گیا۔ اس کمیشن میں صرف ایک عالم دین تھے اور باقی سب وہی لوگ تھے

جن کا تذکرہ ہم اوپر کر چکے ہیں۔ اس کمیشن نے جو سفارشات کیں اور اپنے غلط نظریات کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے جس طرح قرآن و سنت کے ساتھ تلعّب کیا اس پر تمام ملک چیخ اٹھا علماء نے متفقہ طور پر ان سفارشات کی شدید مخالفت کی۔ جب ان لوگوں نے دیکھا کہ ہماری سرتوڑ کوششوں کے باوجود ملک کی بھاری اکثریت میں ابھی اتنی جان باقی ہے کہ وہ دین کا مثلہ کرنے کی کسی کوشش کو برداشت نہیں کرتی تو ان سفارشات کو لپیٹ کر رکھ دیا کہ پھر کسی "موسم بہار" میں یہ پودا لگائیں گے۔ ان لوگوں کی خوش قسمتی سے یہ "موسم بہار" جلد ہی آگیا اور ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ چنانچہ بڑی دھوم دھام سے یہ پودا لگایا گیا ———— اور فوج، پولیس اور سی آئی ڈی کے پہرے اس پودے پر لگا دیئے گئے کہ اگر کوئی مذہبی دیوانہ اس پودے کی طرف آنکھ بھر کے دیکھے تو اس کی آنکھ نکال لو اور انگلی سے اشارہ کرے تو اس کی انگلی قلم کر دو۔

لیکن آفرین ہے ان علمائے حق پر جنہوں نے دین کی بے حرمتی پر خاموش بیٹھنا گوارا نہ کیا۔ جس سے جو کچھ ہو سکا اس نے کیا اور خدا اور رسول سے وفا کے عہد کو نبھایا۔ اس سلسلے کی ایک کڑی یہ کتاب بھی ہے جسے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے صاحبزادے مولوی محمد تقی صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے تفصیل کے ساتھ پوتے کی میراث، تعددِ ازواج احکامِ طلاق اور عمرِ نکاح کے مسائل پر کتاب و سنت کی روشنی میں تفصیلی بحث کی ہے۔ کتاب کا مقدمہ مفتی صاحب دامت برکاتہم نے تحریر فرمایا ہے۔

**نظامِ صلاح و اصلاح** | مصنف: مولانا عبدالباری ندوی سابق پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ
ناشر: ادارۂ مجلسِ علمی کراچی قیمت مجلد ساڑھے تین روپیہ۔ صفحات ۲۸۷۔

مولانا عبدالباری ندوی برصغیر پاک و ہند کے ایک جانے پہچانے بزرگ ہیں۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے ارادت کی وجہ سے اصلاح و تبلیغ کا ایک جذبہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں انہوں نے سورۂ والعصر کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کی (باقی صفحہ ۳۶۲ پر)